

# اسرارِ خودی

فارسی اشعار کا منظوم ترجمہ



از اقبال<sup>ؒ</sup> مترجم  
عبدالرشید فاضل

اقبال

# اسرارِ خودی

مترجم  
عبدالرشید فاضل

# تعارف

کسی دوسری زبان کے مضامین و مطالب کو کسی اور زبان میں منتقل کرنا نہایت دقت طلب امر ہے۔ خصوصاً جب کہ مضامین فلسفیانہ نازک خیالی کے ساتھ زبان شعر میں ادا ہوئے ہوں اور اس کا ترجمہ بھی شعروں میں کیا جا رہا ہو تاہم فاضل مترجمین نے علامہ اقبال کی معرکہ المراء تصنیف اسرار و موز کا منظوم ترجمہ پیش کر کے ایک اہم کام انجام دیا ہے۔

حکیم الامت علامہ محمد اقبال کی کتاب اسرار و موز کا فارسی زبان سے اردو میں یہ ترجمہ ہمارے اشاعتی پروگرام کی ایک اہم کڑی ہے۔ جو اقبال اکادمی پاکستان داناؤں کے فکر و پیغام کی ترویج و تفہیم کے لئے کر رہی ہے۔ اقبال ہمارے قومی شاعر ہیں اور اردو ہماری قومی زبان ہے۔ چنانچہ اسرار و موز جیسی اہم کتاب کا اردو میں ترجمہ ایک ناگزیر ضرورت تھی۔

اسرار و موز کے حصہ اسرار خودی کا ترجمہ جناب عبدالرشید فاضل اور موز بخودی کا ترجمہ جناب کوکب شادانی نے کیا ہے ہم اسے ایک ساتھ اس لئے شائع کر رہے ہیں تاکہ اسرار خودی، جو کہ خودی کے مفہیم و مطالب کی توضیح اور موز بخودی جو کہ فلسفہ بخودی کی سماج میں اطلاقی کیفیت کی آئینہ دار ہے، کا تسلسل قائم رہے جس طرح شکوہ اور جواب شکوہ کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا، اس طرح موز بخودی کو بھی اسرار خودی سے الگ کرنے سے فکر اقبال کے اعجاز و سخن سے استفادہ نہیں کیا جاسکتا۔

ہمیں امید ہے کہ قارئین، نہ صرف ان تراجم کو پسند فرمائیں گے، بلکہ ان کے بارے میں اپنی رائے سے بھی ہمیں مطلع فرمائیں گے۔ تاکہ ان آراء کی روشنی میں خوب سے خوب تر کی کوشش کی جاسکے۔

## پیش لفظ

مثنوی "اسرار خودی" ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی۔ اب اسے جو یورپ اور امریکہ میں اقبال کی شہرت کا سبب بنی، ڈاکٹر نکسن نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا تو ان ممالک میں اس پر ریویو لکھے گئے اور اس طرح یورپ اور امریکہ کو اقبال کے انکار سے واقف ہونے کا موقع ملا۔ اب تک اقبال ایک شاعر کی حیثیت سے مشہور تھے لیکن اس مثنوی کی اشاعت کے بعد اسے ان کو ایک فلسفی اور مفکر کی حیثیت سے دیکھا جانے لگا۔ اس لئے کہ اس مثنوی میں انہوں نے اپنے "فلسفہ خودی" کو ایسی دلنشین ترتیب اور ایسے مفکرانہ انداز میں پیش کیا ہے جو ایک شاعر کے انداز فکر سے بالکل مختلف ہے۔ شاعر کی فکر میں یہ ترتیب، یہ باتا عددی اور یہ استدلالی شان کہاں ہوتی ہے! انہوں نے خود بھی فرمایا کہ

شاعری زین مثنوی مقصود نیست - بت پرستی، بت گری مقصود نیست

حسن اندازِ بیاں از من مجھو! - خوان روا صفہاں از من مجھو!

یوں تو اقبال کے کلام میں فلسفیانہ خیالات کی اس قدر بہتات ہے کہ شاید ہی کسی دوسرے شاعر کے ہاں ہو، پھر افکار کا یہ تنوع اور خیالات کی یہ گونا گونی تو اقبال کے سوا کہیں مل ہی نہیں سکتی۔ مگر ان کی شہرت کو جس فلسفے نے پر پر واز لگائے وہ یہی فلسفہ خودی ہے۔



بہر حال اس موقع پر فلسفہ خودی پر بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ یہ چند سطریں بطور تمہید کے حوالہ قلم کی ہیں۔ ترجمے کے بارے میں گزارش ہے کہ جب میں نے اسرار خودی کا مطالعہ کیا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ کتاب، اگرچہ مختصر ہے، مگر بڑی جامع ہے اور اس قابل ہے کہ مسلمان اسے پڑھیں اور سمجھیں بلکہ اس کو اپنا دستور العمل بنائیں۔ اس خیال نے مجھے اس بات پر آمادہ کیا کہ اس کا منظوم اردو ترجمہ کروں تاکہ یہ خیالات فارسی سے اردو میں منتقل ہونے کے بعد زیادہ سے زیادہ عام ہو سکیں۔ اس لئے کہ یہ خیالات ایسے ہی ہیں کہ ان کو قوم میں زیادہ سے زیادہ جاری و ساری ہونا چاہئے۔ لہذا یہ عام فہم اردو زبان میں ترجمہ کیا۔ اگرچہ یہ دعویٰ کرنا کہ میں نے ترجمہ کا حق ادا کر دیا ہے بہت بڑا بول ہو گا۔ ویسے بھی بقول مولانا ظفر علی خاں مرحوم کہے۔

”یہ حقیقت محتاج تشریح نہیں ہے کہ ایک زبان کی نظم کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا آسان نہیں۔ جس طرح ایک قالب کی روح دو سرے پیکر میں نہیں بھونکی جاسکتی اس طرح ایک زبان کی نظم کو دوسری زبان کے قالب میں نہیں ڈھالا جاسکتا۔ کیونکہ اس طریقے سے زبان کی مقامی لطافت کا مزہ جانا رہتا ہے۔“

تاہم اس میں بھی شک نہیں کہ یہ ترجمہ بھی جس وقت و کاوش سے ہوا ہے وہ میں ہی جانتا ہوں۔ کئی دفعہ اس کام سے دستبردار ہو جانے کا ارادہ کر لیا۔ مگر جس نیت سے یہ کام شروع کیا گیا تھا وہ نیک تھی اور خود بخود و جلیب منفعت کے جذبے سے پاک اس لئے توفیق الہی نے ساتھ نہ چھوڑا اور جس قلم نے بسم اللہ لکھی تھی آخر اسی نے تمت تک لکھ کر دم لیا۔

فارسی زبان سے اردو میں ترجمہ کرنا اور پھر نظم کا نظم میں اس لئے بھی مشکل ہے کہ فارسی کا ایک فقرہ کبھی کبھی ایک پوری عبارت کا مضمون ادا کر دیتا ہے، ایک مصرع میں بعض اوقات معانی و مطالب

کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے۔ اردو میں یہ بات کہاں! اس کے علاوہ زبانِ فارس کی شیرینی اور خیالات عالیہ کے بیان کرنے کی قابلیت بھی مستمم ہے جیسا کہ خود اقبال فرماتے ہیں۔

گرچہ ہندی در غنوبت شکر است . طرزِ گفتار وری شیریں تر است

نکر من از جہوہ اش مسح گشت ۔ خامہ من شاخ نخل طور گشت

پارسی از رفعتِ اندیشہ ام ۔ در خورد با فطرتِ اندیشہ ام

پس ان گوناگوں مشکلات کے ہوتے ہوئے اگر ترجمہ میں وہ دلربائی نظر نہ آئے جو اصل کے ایک

حرف میں موجود ہے تو مجھے معذور سمجھا جائے۔

ترجمہ حتی الامکان لفظی کیا ہے۔ اور اس بات کی کوشش کی ہے کہ جہاں تک ہو سکے اصل کتاب کے

الفاظ اور فقرہ ہی سے ترجمہ کیا جائے۔ اس کے دو سبب ہیں ایک یہ کہ جو تاثیر حضرت علامہ کے الفاظ میں

ہے وہ دوسرے الفاظ میں نہیں ہو سکتی۔ دوسرا یہ کہ ان افکار عالیہ کے بیان کرنے کی قابلیت بھی جو ان الفاظ میں ہے

دوسرے الفاظ میں کیوں کر ہو سکتی ہے کہ یہ الفاظ ایک مفکر کے علم و مشاہدہ اور تفحص کا نتیجہ ہیں۔ ہاں ایک بات میں

نے اپنی طرف سے کی ہے وہ یہ کہ اسرارِ خودی کی بحر کے بجائے ایک رکی کے اضافے سے ایک دوسری ہی بحر

میں ترجمہ کیا ہے۔ اس سے یہ آسانی ہو گئی کہ ایک شعر کا ترجمہ ایک ہی شعر میں ہو گیا۔ البتہ جہاں زبان نے ساتھ

نہیں دیا اور فارسی الفاظ اور محاورات کا اردو میں مترادف لفظ اور محاورہ مل گیا تو اصل الفاظ کے چھوڑ دیئے

میں بھی تامل نہیں کیا ہے۔ ان تمام رعایتوں، احتیاطوں اور امکانات کوششوں کے باوجود بھی اس بات کا مکرر

اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے جواہر گراں بہا کے پہلو میں عزت ریزوں کو جگہ دی ہے اور جامِ جہاں تما کے مقابلے

میں جامِ سفال کو پیش کیا ہے اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ کلامِ شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم۔

سید عبدالرشید فاضل

جون ۱۹۷۷ء

# فہرس

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر	نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱	ترجمہ	۱	۱۱	اسماء علی مرتضیٰ رحمہ اللہ	۴۶
۲	تہیید	۲	۱۲	حکایت ایک نوجوان مروزی	۵۱
۳	اس بیان میں کہ نظام عالم اللہ	۱۱		کی اللہ	
۴	اس بیان میں کہ حیات خودی اللہ	۱۴	۱۳	حکایت اس پرندے کی اللہ	۵۴
۵	اس بیان میں کہ خودی جب عشق و محبت		۱۴	حکایت الماس وزغال	۵۶
۶	اللہ		۱۵	شیخ و برہن کی حکایت اللہ	۵۸
۷	اس معنی میں کہ نفی خودی کا اللہ	۳۰	۱۶	میرنجات نقش بند کی نصیحت اللہ	۶۵
۸	مرحلہ اول اطاعت	۳۹	۱۷	الوقت سیف	۷۱
۹	مرحلہ دوم ضبط نفس	۴۱	۱۸	دعا	۷۷
۱۰	مرحلہ سوم نیابت الہی	۴۳			

دی شیخ با چراغِ بھی گشت گردِ شہر  
 کر دِ اَم و دِ مَلُوم و اِنسا نَم آرزو ست  
 زین ہمریانِ سُست عناصرِ دِل گرفت  
 شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزو ست  
 گفتم کہ یافت می نشود حُبِ تہ اِیم ما  
 گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزو ست

(مولانا جلال الدین رومیؒ)

## ترجمہ

کل شہر میں چراغ لئے پھر رہا تھا شیخ  
 کہتا تھا ناکسوں میں اک انساں کی ہے تلاش  
 دِل بچھ گیا ہے سُست رفیقانِ راہ سے  
 شیرِ خدا و رستمِ دستان کی ہے تلاش  
 میں نے کہا کہ ڈھونڈ کے ہم تھک رہے اُسے  
 کہنے لگا کہ ایسے ہی انساں کی ہے تلاش



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

# ترجمہ) اسرارِ خودی

## تمہید

نیست در خشک و تربیشہ من کوتاہی  
چو پھر نخل کہ منبر نشو و دار کتم

(فقیرِ نیشاپوری)

## ترجمہ

مرے جنگل کے خشک و تر میں ہر اک چیز ممکن ہے

بنالیتا ہوں سولی، جو شجر منبر نہیں بنتا

کاروانِ شب جو لوٹا مہرِ عالم تاب نے چھینٹے مارے گل پہ، میرے گریہ بیتاب نے

چشمِ نرگس سے، مرے اشکوں نے، دہویا خواب کو اور کہا سبزے سے نالوں نے کہ اب بیدار ہو

باغبان نے آزیابا جب مرا زورِ کلام  
 میسر ہی اشکوں کے دانوں کو چمن میں بچا دیا  
 ذرہ ہوں پر میرے قبضے میں ہے خورشیدِ جہاں  
 جامِ جم سے بھی کہیں روشن یہ میری خاک ہے  
 باندھتی ہے فکر وہ آہو مرے فتراک سے  
 جو آگاہ سبز نہ اب تک، وہ مرے گلشن میں ہے  
 میں ہوتا رگِ عالم پہ جب مضربِ زن  
 سازِ فطرت ہے زمانے میں مرا نادر نوا  
 عالمِ امکان میں اک خورشیدِ نوزائید ہوں  
 میری جولانی نہ دیکھی چشمِ انجم نے ابھی  
 بحرِ کو میری ضیاء کے رقص سے بہا نہیں  
 یہ جہاں تا آشنا ہے میرے محسوسات سے  
 بویاک مصرع، ملی حاصل میں تیغِ سبز فام  
 میرا تارِ نالہ صرف کسوٹِ گلشن ہوا  
 میں ہزاروں صبح رکھتا ہوں گریباں میں نہاں  
 راز ہائے بطن گیتی کا مجھے ادراک ہے  
 جو ابھی باہر نہ آیا نیستی کی خاک سے  
 شاخ پر جو گل نہ آیا، وہ مے دامن میں ہے  
 درہم و برہم ہوئی را مشگری کی انجمن  
 ہمیشہ نعموں سے میرے کس طرح ہوں آشنا  
 رسمِ دنیا اور آئینِ فلکِ نا دیدہ ہوں  
 بند ہے اب تک مے سیما میں آشفستگی  
 کوہِ کورنگِ خا میرا سا مل سکتا نہیں  
 ڈر رہا ہوں اسلئے میں ان کو دکھلاتے ہوئے

مطلعِ خاور سے جب پیدا ہوئی میری سحر  
 انتظارِ صبح خیزاں کرنے کرتے تھک گیا  
 نغمہ ہوں لیکن ابھی نخمے سے بے پروا ہوں  
 یہ زمانہ محرمِ اسرار ہو سکتا نہیں  
 میسرِ مطالب کے نہیں میرے رفیقانِ قدیم  
 قلمِ اجاب ہے مانندِ شبنم بے خروش  
 میرا نغمہ ہے جہاں کا وہ جہاں ہی اور ہے  
 سینکڑوں شاعر ہیں ایسے، مے کے جو زندہ ہوئے  
 مر گئے جب وہ توشیحِ بزمِ دوراں ہو گئے  
 گرچہ اس صحرا سے گزرے ہیں ہزاروں قافلے  
 عاشقِ صادق ہوں اور فریاد ہے ایماں مرا  
 نغمہِ شوریدہ یاربِ ابار کے بس کا نہیں

شبنم تو سے ہوئے گلہائے عالم تازہ تر  
 کاش پیدا ہو کوئی زرتشتِ میری آگ کا  
 حال میں گویا نوائے شاعرِ فردا ہوں میں  
 میرا یوسفِ رونقِ بازار ہو سکتا نہیں  
 مضطرب ہے، طورِ میرا بھرِ دیدارِ کلیم  
 میری شبنم مثلِ بحرِ سبکراں، طوفانِ بدوش  
 اس درائے کا ڈال کا کارواں ہی او ہے  
 اپنی آنکھیں بند کیں اور ہم کو بینا کر گئے  
 صورتِ گلِ خاک سے اپنی نمایاں ہو گئے  
 مثلِ گامِ ناقہ لیکن وہ بہت خاموش تھے  
 شورِ محشر پیشِ خدمت ہے مرے ہنگامے کا  
 ٹوٹ جاتے سازِ میرا اس میں ڈرتا نہیں

قطرہ بہتر ہے مرے سیلاب سے بیگانہ ہو  
 ہو سمندر ہی کوئی، اس کا اگر دیوانہ ہو  
 ظرفِ جو میں کب سے وسعت بحرِ عماں کے لئے  
 وقت ہو جا میں سمندر میرے طوفاں کے لئے  
 سعتِ گلزار جس غنچے کے اماں میں نہیں  
 وہ مرے ابر پہاری کے لئے شایاں نہیں  
 پالتی ہے بھلیوں کو میری جان ناتواں  
 میری جولانگاہ کا کوہ و بیاباں اک نشاں  
 میرے دریا کے مقابل تھا اگر صحرا ہے تو  
 لے مری بھلی کو دامن میں اگر سینا ہے تو  
 چشمہ آب بقا آیا جہاں میں میرے بات  
 مجھ کو خالق نے بنایا محرمِ رازِ حیات  
 ذرہ بھی سوزنوا سے میرے زندہ ہو گیا  
 اور جگنو کی طرح پرکھوں کر اڑنے لگا  
 راز گو مجھ سا جہاں میں اور ہو سکتا نہیں  
 مجھ سے آکر پوچھ لے اسرارِ عیشِ جاوداں  
 اور کوئی یہ درِ معنی پر ہو سکتا نہیں  
 دیکھ لے افکار میں میرے زمین و آسمان

پیر گردوں نے کہے ہیں مجھ سے اسرارِ حیات  
 کس طرح اپنے نذیموں سے چھاؤں کوئی بات؟

ساقیا بھرے خدا کے واسطے یہ جام بھی!  
 کامراں ہو جاتے تیرے فیض سے ناکام بھی!



اصل زمزم جس کی ہے، وہ آتشیں پانی پلا  
 آدمی کی فکر کو کرتا ہے جو ہشیار اور  
 بخشہ دیتا ہے وقار کو، جو اک کاہ کو  
 خاک تیرہ کو بناتا ہے ثریا آستان  
 خامشی کو شورش محشر بنا دیتا ہے جو  
 ساقیا بھر دے مرا سا غر شراب نابے  
 تاشنا سائے رہ منزل دل آوارہ ہو  
 جستجوئے تازہ سے ہو جاؤں میں تا گرم و  
 نور بن جاؤں غرض میں ہل کی آنکھ کا  
 قیمت جنس سخن کو تا دو بالا کر سکوں  
 کھول دوں دنیا پہ پھر فیضانِ پیر دم سے  
 حان رومی عشق کے شعلوں سے ہے سراپہ دار  
 وہ کہ ہے اس کا گدا جمشید اپنے وقت کا  
 دیدہ بیدار کو کرتا ہے جو بیدار اور  
 شیر کی قوت عطا کرتا ہے جو رو باہ کو  
 قطرہ ناجیز کو کرتا ہے بحر بے کراں  
 سُرخ خون باز سے کرتا ہے پائے کبک کو  
 دور کرتا ریختی افکار کو مہتاب سے  
 آشنائے ذوق بے تابی مرا نظارہ ہو  
 اور رہوں لذت شناس آرزوئے نوبہ نو  
 اور جہاں کے کان میں ہو جاؤں گم مشل صدا  
 چاہتا ہوں اس میں شامل آنسوؤں کو بھی کڑوں  
 سنیکڑوں درہائے بستہ مخزن اسرار کے  
 میں جہاں میں ایک دم کی روشنی مثلِ شرار

شمع نے مارا ہے اک شبنوں مے پر دانے پر  
 اور شراب ناب نے حملہ کیا پمانے پر  
 خاک کو میری کیا اکسیر پیر روم نے  
 کر دیئے جلوے ہویدا اس غبار تیرہ سے  
 ایک ذرہ خاک سحر کا سوئے گردوں چلا  
 تاکہ دامن تھام لے جا کر شعاع مہر کا  
 موج ہوں میں، اسکے دریا میں اگر منزل کروں  
 ہے یقین کوئی گرا نمایہ گہر حاصل کروں

میں کہ ہے اس کی شراب ناب مے مستی مری  
 اس کے انفاس مبارک ہے میری زندگی

شب مرا اندوگیں دل مائل فرادیتھا  
 شورش یارب سے ہنگام سکوت آباد تھا  
 مبتلائے شکوہ بے مہری دوراں تھا میں  
 اور تھی پیمانہ اپنا دیکھ کر نالاں تھا میں  
 طائرِ نظارہ اس پر واز میں اتنا تھکا  
 بال دپر ٹوٹے، گرا، گرتے ہی محو خواب تھا  
 خواب میں آیا مرے پیر حقیقت آشنا  
 وہ زبان پہلوی میں جس نے قرآن لکھ دیا  
 اور کہا مجھ سے کہ لے دیوانہ ارباب عشق  
 بڑھکے لے تو بھی تو اک جام شرابِ ناب عشق  
 اور اپنے دل میں کر ہنگامہ محشر بیا  
 توڑے شبیشہ کو سر پر آنکھ میں نشتر لگا

چھوڑ دے یہ تہقے اور مالہ ہائے زار کر  
 غنچہ ماں کب تک رہیگا باغِ دوراں میں خوش  
 ہیں ترے دل میں بھی ہنگامے بہت مثل سپند  
 اپنی رگ رگ سے تجھے اے بے نوا مثلِ جرس!  
 آگ سے ہو، بزمِ عالم تجھ سے روشن کیوں ہو؟  
 کھول دے محفل پہ تو پیرِ مغان کے راز کو  
 مار دے پتھر پہ تو آئینہ افسوس کو  
 نیستاں کا بانسری کی طرح پھر پیغام دے  
 اپنے نالوں کے لئے اندازِ نوا یحیٰ کو  
 قم کا اک نعرہ لگا، زندوں کو بیانِ تازہ دے  
 اٹھ کے ہو پھر جادۂ آئینِ نو پر گام زن  
 آشنائے لذت گفتار ہونا چاہئے

خون کے آنسو بہا اور ٹکڑے ٹکڑے کر جگر  
 چاہئے ہونا تجھے گل کی طرح نہت فروش  
 آگ پر رکھ محلِ دل کو ذرا اے ارجمند!  
 چاہئے خوابیدہ نالوں کو جگانا ہر نفس  
 اپنے شعلوں سے جلا افسردگانِ خام کو  
 کسوتِ مینا پہن، موجِ شرابِ ناب ہو  
 توڑ دے چوراہے پر اس شیشہ ناموس کو  
 قیس کو آگاہ کر دے قومِ حے کے راز سے  
 بزم کو پھر ہائے و ہوائے تازہ سے آباد کر  
 تاہوں احساساتِ پیدان میں اپنی زلیست کے  
 سر سے اپنے دور کر دے جوشِ سودا کہن  
 اے درائے کارواں! بیدار ہونا چاہئے

لگ گئی میرے بدن میں آگ اس تقریر سے اور ہوا ہنگامہ آرا نالہ شبیگر سے  
اپنے بستر سے اٹھایوں تاسے جیسے صدا اور کانوں کے لئے فردوس کا سماں کیا

آشکارا کر دیا میں نے خودی کے راز کو  
بے حجابانہ دکھایا اک چھپے اعجاز کو

تھی جہاں میں میری مہستی ایک نقشِ ناتمام  
عشق کی صیقل گری نے مجھ کو آدم کر دیا  
میں نے دیکھا ہے فلک کی حرکتِ اعصاب کو  
واسطے انساں کے روئی ہیں آنکھیں کتنی رات!  
رکھتی تھی سینے میں جس کو کارگاہِ ممکنات  
میں، کہ جس نے اس اندھیرے میں جالا کر دیا  
شہرہ جس ملت کا باہر حیطہ اندازہ سے  
ذرہ بو کر مہرِ رخشاں جس نے حاصل میں لئے  
ناقبول و ناکس و ناکارہ گویا محض نام  
عالمِ اسماءِ چون و چند عالم کر دیا  
اور رگوں میں چاند کی دورانِ خونِ ناب کو  
تب کیا ہے چاک میں نے پردہ رازِ حیات  
میں نے افشا کر دیا وہ رازِ تقویمِ حیات  
کچھ نہیں اک ناکِ پاہوں ملتِ اسلام کا  
دل میں شعلے مشتعل جس کے سرودِ تازہ سے  
بھرنے خرمن ہزاروں رومی و عطار کے



ہوں سراپا آہ منزل ہے مری چرخ بریں      گو کہ ظاہر میں دہواں ہوں خلقت ہوں آتشیں  
میرے خامے نے مری فکر رسا کے زور سے      کھول کر افلاک کے اسرار پہناں رکھ دیئے

تاکہ قطرہ جان لئے ہم پایہ دریا ہوں میں  
ذرہ بھی سمجھے حریف وسعت صحرا ہوں میں

اس سخن گوئی سے میرا شاعری منشا نہیں      بت پرستی، بتگری، ہرگز مرا شیوا نہیں  
فارسی نا آشنا ہوں، اہل ہے ہندی مری      ہے مرا پیما نہ خالی ماہ نو ہوں میں ابھی  
حسن اندازِ بیاں کی مجھ سے مت امید کھ      خوانسار و اصفہاں کی مجھ سے مت امید کھ  
گرچہ شیریں ہے بہت ہندی بھی بے چوں چرا      ہے مگر طرزِ زبان فارسی شیریں سوا  
ہو گیا مسحور اس کے حسن سے فکر رسا      بن گیا ہے شاخِ نخلِ طور یہ خامہ مرا  
مجھ کو خالق نے دیا ذہن رسا، فکر بلند      اس لئے مجھ کو زبان فارسی آئی پسند

نکتہ چیں! میری شراب ناب سے ہو بہرہ ور  
عیب اگر دنیا میں ہو کوئی تو کچھ پروا نہ کر

اس بیان میں کہ نظام عالم کی اصل خودی سے ہے اور تعینات  
وجود کی زندگی کا تسلسل استحکام خودی پر موقوف ہے۔

ہم جہاں کہتے ہیں جس کو، ہیں یہ آثار خودی  
سو یہی تھی جب خودی غیر خدا کچھ بھی نہ تھا  
ایسے عالم سینکڑوں پوشیدہ اس کی ذات میں  
آپ ہی کو غیر سمجھا، یہ غضب کیسا کیا!  
غیر کے پیکر بناتی ہے وہ اپنے ہاتھ سے  
مارتی رہتی ہے ان کو قوت بازو سے وہ  
خود فریبی ہے خودی کے واسطے عین حیات  
سینکڑوں باغوں کا خون کرتی ہے اک گل کے لئے  
اک فلک کے واسطے پیدا کئے صد ہا بلال!  
اور جو پوچھو کیوں، یہ اسرار ادبیں دلی  
کہتی ہے، از بہر تکمیل جمال معنوی

حسن شیریں کو بنایا عذر درو کو پہن  
 سوزِ پیہم کو جو پروانوں کی قسمت میں لکھا  
 سینکڑوں امروزی کے نقشے بنا کر رکھ دیئے  
 لاکھوں ابراہیم کو دکھلا دیئے شعلوں کے باغ  
 اس جہانِ آب و گل میں بہرِ اغراضِ عمل  
 بھاگتی اور دوڑتی، اٹھتی اٹھاتی ہے وہی  
 اس کی جولانگاہ ہے یہ وسعتِ بیل و نہار  
 باغِ عالم میں یہ رونق اس کی گل کاری سے ہے  
 اپنے شعلے سے شمر کر اس نے اک حصہ دیا  
 اپنے ٹکڑے کر دیئے اجزا کو پید کر دیا  
 اوپر پریشانی سے جس دم ہو گئی بیزار وہ  
 خود نما ہونا خودی کی ایک عادت ہے قدیم  
 اور نافرمانی کو بنایا عذر آہوئے فتن  
 شمع کو عذر ان کی جانبازی و محنت کا کیا  
 تاکہ اک دن صبح فردائے قیامت دیکھ لے  
 تب کہیں روشن کیا ہے اک محمّد کا چراغ  
 ہے کبھی عامل کبھی معمول و اسباب و علل  
 مارتی مرقی، اُگاتی اور جلاتی ہے وہی  
 اس کی گردِ راہ سے یہ آسماں موجِ غبار  
 رات اس کے خواب سے، دن اس کی بیداری سے ہے  
 اور خرد کو جزو کا وارفتہ و شید کیا  
 خود پریشاں ہو گئی صحرا کو پید کر دیا  
 جمع کر کے اپنے اجزا بن گئی کہسار وہ  
 اس کی قوت ہے نہاں ہر شے میں اے مدِ سلیم!

قوت خاموش ہے لیکن ہے یتیمِ عمل  
اور عمل کے ساتھ ہے پابندِ اسبابِ عمل

ہے جہاں کی زندگی وابستہ زورِ خودی  
قطرے نے حرفِ خودی جس وقت ازبر کر لیا  
بادہ بے پیکر ہے حبِ اپنی خودی میں خام ہے  
اور پیکر اپنا رکھتا ہے اگرچہ جامِ مے  
کوہ نے اپنی خودی کھوئی تو صحرا ہو گیا  
موج جب تک موج رہی ہے تہِ آغوشِ بحر  
دید کی خواہش جب تک آنکھ میں جنبش رہی  
سبزے نے اُگنے کی قوت پانی اپنی ذات سے  
شمع نے پہنائی خود زنجیر اپنے آپ کو  
آپ کو کھویا بنا کر خود گدازِ می کا شعار  
جتنی محکم ہے خودی اتنی ہی محکم زندگی  
اپنی ہستی تنک مایہ کو گھس کر لیا  
اپنے پیکر کے لئے منت پذیر جام ہے  
یہ ہمارا اپنی گردش کے لئے محتاج ہے  
شکوہ سنج جو شش طوفانِ دریا ہو گیا  
رہتی ہے زورِ خودی سے وہ سوارِ دوشِ بحر  
اس سے ہوتی ہی رہیں پیدا شعاعیں نور کی  
پھاڑ ڈالاسیٹہ گلشن کو اپنے ہات سے  
کر لیا دروں سے جب تعمیر اپنے آپ کو  
اپنی آنکھوں سے گری وہ مثلِ شکِ سوگوار



سخت فطرت میں اگر کچھ اور ہو جاتا نکیس      زخم پھر اس طرح اپنے دل پہ وہ کھاتا نہیں  
 جب کہ ہو جاتا ہے نام غیر سے سرمایہ دار      بوجھ سے اس نام کے کرتا ہے سینے کو فگار  
 حب زمیں اپنی خودی میں ہو گئی ثابت قدم      چاند اس گرد کرتا ہے طوافِ دم بہ دم  
 اور زمیں سے بھی سوا محکم ہے ہستی مہر کی      پس زمیں محتاج ہے اس کی نگاہ مہر کی  
 ہوتی ہیں حیران آنکھیں دیکھ کر شانِ چنار      جس کی سطوت ہے کوہستانِ بنِ سرمایہ دار  
 آگ کے شعلوں سے اسکے پیرن کا ہے طراز      اصل ہے اسکی فقط اک دائہ گردن فراز

قوتوں سے ہوتی ہے جس دم خودی سرمایہ دار

کرتی ہے ندی سے پیدا، بحرِ ناپید اکسار

اس بیان میں کہ حیات خودی تخلیق و تولید مقاصد سے وابستہ ہے۔

مدعا ہی سے ہماری زندگی کی ہے بقا      مدعا ہی کا روان زندگی کا ہے درا  
 ہے فقط پیہم تلاش و جستجو میں زندگی      ہے فقط مضمحل سلسلِ آرزو میں زندگی  
 آرزو کو اپنے دل میں زندہ رکھ اے مردِ کار      ورنہ بن جائیگی مشتبہ خاک تیری اک مزار

آرزو ہے بے خبر! جانِ جہانِ رنگ و بو  
 رقصِ دل سینوں میں ہے ہر دم اسی زور سے  
 اس سے اڑنے کے لئے تیار مشتِ خاک بھی  
 دل کی ہے لے دیکھے سوزِ آرزو سے زندگی  
 آرزوئے نوبہ نو سے دل اگر خالی ہوا  
 آرزو پر ہے تگ و تارِ خودی کا انحصار  
 آرزو صیدِ مقاصد کے لئے ہے اک کمند  
 آدمی بے آرزو کے فی الحقیقت مردہ ہے  
 دیدہ بیدار کیا ہے اہل میں اے ہوشیار!  
 کبک کو پاؤں دیئے ہیں شوخیِ رفتار نے  
 ہو گئی جب بالنسری اپنے نیستاں سے جدا  
 عقل جو گیتی نوردِ آسماں پر وانہ ہے  
 ہے یہاں ہر چیز کی فطرت امینِ آرزو  
 اس کی تابانی سے بن جاتے ہیں سینے آئینے  
 خضرِ رہ بن جاتی ہے یہ موسیٰ ادراک کی  
 غیر حق کی موت ہے جب دل میں یہ پیدا ہوئی  
 شہپر پر داز ٹوٹے اور زمیں پر آ رہا  
 آرزو بحرِ خودی کی ایک موج بے قرار  
 آرزو ہے دفترِ افعال کی شیرازہ بند  
 جس طرح گرمی نہ ہو تو شعلہ بھی افسردہ ہے  
 لذتِ دیدار نے کر لی ہے صورت اختیار  
 دی ہے یہ منقارِ بلبل کو نواسے زار نے  
 ہو گیا زنداں سے اس کا لغمہ بھی آخر رہا  
 تو سمجھتا بھی ہے کچھ نادان! یہ کیا راز ہے؟

آرزو سے زندگی ہوتی ہے جب سرمایہ دار  
 کیا ہے نظم قوم اور کیا ہیں یہ آئین رسوم؟  
 آرزو سے بڑھی اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی  
 دست و دندان کیا ہیں اور چشم و داغ و گوشت کیا؟  
 زندگی نے جنگ کے میدان میں جب رکھا قدم  
 آگہی ہرگز نہیں ہے علم و فن سے مدعا  
 علم و فن سامان ہیں حفظ زندگی کے واسطے  
 زندگی کے علم و فن ادنیٰ سے ہیں خدمت گزار  
 زندگی کے راز سے غافل ذرا ہوشیار ہوا  
 ایسا مقصد، صبح کے مانند جو تابندہ ہو  
 ایسا مقصد، آسمانوں سے کہیں بالا ہو جو  
 برق بن کر خرمن دنیا سے باطل پھونک دے  
 آرزو سے ہوتی ہے پیدا یہ عقل طرفہ کار  
 اور ہیں کیا چیز یہ انواع و اقسام علوم؟  
 پھر ہر اک ٹکڑے نے پیدا کر لی ایک صورت نئی  
 اور یہ فکر و تخیل اور شعور و ہوش کیا؟  
 کر لئے آلات یہ اپنے تحفظ کے بہم  
 غنچہ و گلبن نہیں جیسے چمن سے مدعا  
 ہیں یہی اسباب تقویم خودی کے واسطے  
 زندگی کے علم و فن ہیں خانہ زادائے کام کا  
 اور کیفیت بادہ مقصود سے سرشار ہو  
 ماسویٰ کے حق میں جو اک آتش سوزندہ ہو  
 دلستانی، دلربائی میں بہت یکتا ہو جو  
 اور عالم میں ہوا اک فتنہ محشر کرے

رکھتی ہے تخلیق مقصد زندگی سے کامیاب  
 آرزو کے دم سے قائم ہے ہماری آفتاب  
 اس بیان میں کہ خودی عشق سے مستحکم ہوتی ہے۔

نور کا وہ ایک لفظ نام ہے جس کا خودی  
 وہ محبت کے سبب سے اور بھی ہے استوار  
 اس کے جوہر میں چمک ہوتی ہے پیدا عشق سے  
 اس کی فطرت عشق سے ہوتی ہے جب آتش بجا  
 عشق کو تلوار کا ڈر ہے، نہ کچھ خنجر سے باک  
 عشق صلح و آشتی ہے عشق ہی پیکا ہے  
 عشق کی ادنیٰ نظر سے سنگِ خارا پاش پاش  
 لے کسی معشوق کی الفت کا سودا اپنے ہر  
 رکھ کسی کامل کے سنگِ آستان پر اپنا سر  
 جو ہمارے تن میں ہے مہل شرارِ زندگی  
 ہے اسی سے وہ درخشاں و راسی سے پائدار  
 ارتقا ہوتا ہے اس کی قوتوں کا عشق سے  
 روشنی سے اس کی ہوتا ہے منور اک جہاں  
 عشق کی طینت میں کب داخل ہیں آبِ با و غا  
 عشق ہی آبِ بقا ہے، تیغ جو ہر دار ہے  
 عشق حق میں طاقت حق ہے، یہ سمجھے کوئی کاش!  
 اور پیدا قلبِ یوسف و نگاہِ لوحِ کر  
 ہے بنانا اپنی مشیتِ خاک کو اکسیر اگر

مثل مولاناؔ رومیؔ اپنی شمع کو جلا  
 ہے ترے دل میں ہی اک معشوق پہاںؔ خبر!  
 اس کے عاشقؔ خوب رویاں جہاں سے خوب ہیں  
 عشق سے اس کےؔ ثریا پر پہنچ جاتی ہے خاک  
 عشق کی کیفیتوں سے آگیا جب اس کو وحد  
 ہے دلؔ جہاں میں مسلمان کے مقام مصطفیٰؐ  
 طور کیا ہے؟ اسکے کاشانے کی اک موجِ غبار  
 ہے ابد اک آن اوقاتِ شہِ نولاک سے  
 ٹاٹ کا ٹکڑا ہے اسکے خوابِ راحت پہاں  
 وہ شبستانِ حرا میں جب ہوا خلوتِ نشیں  
 کتنی راتوں میں کی آنکھیں یک دم سوئی نہیں  
 وقتِ جنگ آیا تو اسکی تیغ ہے آہن گداز

پھونک دے تبریز کی بھلی سے خرمنِ روم کا  
 آ، دکھاؤں تجھ کو میں تو آنکھ رکھتا ہے اگر  
 کتنے زیبا، کیسے خوش رو، کس قدر محبوب ہیں!  
 عشق سے اس کےؔ تو انا عاشقانِ سببہ چاک  
 اٹھ کے جا پہنچی زمیں آسماں پر خاکِ نجد  
 آبروِ مسلم کی ہے دنیا میں نامِ مصطفیٰؐ  
 اور اس کا گھر ہے کعبے کا حرم اے ہوشیار!  
 طالبِ فزائش کی ہے شہ اس کی ذاتِ پاک سے  
 اور غلاموں نے کئے ہیں تاجِ کسریٰ پا کمال  
 ہو گئے پیدا، حکومت، قوم اور آئینِ دین  
 کر دیا امت کو لیکن مالکِ تاج و نگین  
 اشک بار آنکھیں ہیں جس دم ہو گیا محو نماز

معرکوں میں، قاطع نسلِ سلاطین اسکی تیغ  
 اس نے دنیا کے لئے آئین نو پیدا کیا  
 دین کی کنجی سے کھولا دولتِ دنیا کا در  
 توڑ ڈالا اس نے ادنیٰ اور اعلیٰ کا نظام  
 جنگ میں جس وقت اس شاہِ اُم کے سامنے  
 تن برہنہ پاؤں تھے زنجیریں جکڑے ہوئے  
 جوں ہی اس عالم میں حضرت کی نظر اس پر پڑی  
 آج اس سے بھی زیادہ آہ بے پردا ہیں ہم  
 اعتبار اپنا ہے محشر میں شاہِ دو جہاں  
 اس کا لطف و قہر اکِ حمت، دنیا کے لئے  
 دشمنوں پر جس نے بارانِ کرم برسا دیا  
 ہم کہ دنیا میں وطن کی قید سے آزاد ہیں  
 اور ہنگامِ دعائے فتح، آئیں، اس کی تیغ  
 مسدود اقوامِ ماضی کو الٹ کر رکھ دیا  
 لائے گی ثانی کہاں سے اس کا یہ نوعِ بشر  
 اپنے دستِ خوان پر بٹھلا لیا اپنا غلام  
 قید میں اس طرح آئی دخترِ سردارِ طے  
 اپنی گردن کو جھکا رکھا تھا مائے شرم کے  
 اپنی چادر روئے دخترِ پُر اٹھا کر ڈال دی  
 رو بہ واقوامِ عالم کے بہت رسوا ہیں ہم  
 اور دنیا میں ہماری آبرو کا پاسباں  
 دوستوں کے حق میں یہ، وہ دشمنوں کے واسطے  
 جس سے لاشریب کا پیغام مگے نے سنا  
 ایک ہیں گوہرِ طرف، ہر ملک میں آباد ہیں



گو جازی اور صینی اور ایرانی ہیں ہم  
 سب کے سب بدستِ چشمِ ساقی لطحا ہیں ہم  
 امتیازاتِ نسب اس نے مٹا ڈالے تمام  
 اس نظامِ قوم کی وہ جان ہے، گو ایک ہے،  
 اس کے دل کا رازِ سرستہ ہماری قوم تھی  
 میری خاموشی میں شورِ عشق اس کا آشکار  
 میں بھلا اس کی محبت کا بیاں کیونکر کروں !  
 ہستیِ مسلم اسی کی اک تجلی گاہ ہے  
 اس کے آئینے کا ہے اک عکس یہ پیکرِ مرا  
 دم بدم بیتابی دل سے مجھے آرام ہے  
 وہ برابر بہاری ہے میں اس کا باغ ہوں  
 کشتِ الفت میں جباں آنکھوں کو میں نے بودیا  
 ہر جگہ شبنم مگر اک صبح خنداں کی ہیں ہم  
 اور جہاں میں متحد مثلِ مے و مینا ہیں ہم  
 اس خس و خاشاک کا چھوڑا نہیں دنیا میں نام  
 جیسے ہر تپتی ہزارے کی الگ، بوا یک ہے  
 نعرہ بے باکانہ مارا اس نے یہ ظاہر ہوئی  
 اس کی الفت کے ہزاروں نغمے مجھ سے ہم کنار  
 روئی ہے فروت میں اس کی خشک لکڑی اشکِ خوں  
 طور پیدا جس سے ہوں وہ اس کی گردِ راہ ہے  
 ہے وجود اس نیرِ اعظم سے میری صبح کا  
 صبحِ محشر سے زیادہ گرم میری شام ہے  
 اس کی بارش سے اُنکھ کی رگ رگ میں خوں  
 کیا کہوں کیسا تماشا مجھ کو حاصل میں ملا !

خاکِ شرب کے مقابل ہیچ ہیں دونوں جہاں      کتنا اچھا شہر ہے وہ اپنا دلبر ہے جہاں !  
 مار ڈالا مجھ کو طرزِ مولوی جام نے      اس کی نظم و نثر میں پایا علاج اس خام نے  
 ہیں ہزاروں معنی دلکش لباسِ سادہ میں      شعر کیا موتی پروئے ہیں ثنائے خواجہ میں

نسخہ کونین را دیباچہ اوست

جہدِ عالم بندگان و خواجہ اوست<sup>۵۱</sup> (جائی)

حاصلِ صد کیفیت صہائے جامِ عشق ہے      اویہ تقلید کیا ہے؛ ایک نامِ عشق ہے  
 کاملِ بسطام جو تقلید میں تھا لا جواب      کر لیا خربوزہ کھائے بھی اس نے اجتناب  
 تو بھی عاشق ہے تو پھر ایسی ہی کر تقلید یار      تیرا جامِ عشق بھی ہو جائے گا یزدانِ شرکا  
 اک ذرا اپنے حرائے دل میں کر لے اعتکان      جانبِ حق چل خودی کی چھوڑ کر لاف و گزان  
 حق سے محکم ہو کے پھر خود کی طرف ہو گامزن      اور بن جالات و عزائے ہوس کا بت شکن  
 عشق کی قوت سے پہلے ایک لشکر جمع کر      شوق سے پھر عشق کے فاراں پر ہو جلوہ گر

تاکہ نازل تجھ پہ ہوں الطاف و افضالِ خدا

اور بنے تو مظہرِ اتی جاعِل "فی الارض" کا

۵۱ ترجمہ: معطیٰ اس نسخہ کونین کا دیباچہ ہے      سارا عالم ہے غلام اس کا وہ سب کا خواجہ ہے

اس بیان میں کہ خودی سوال سے ضعیف ہو جاتی ہے۔

کے بھی حاصل کیا تھا جس لئے شہر وں سے خراج! آج ناداری کے باعث ہو گیا روبہ مزاج  
 یہ مصیبت پر مصیبت نتجہ پہ ناداری سے ہے درود کہہ تیرا تھی دستی کی بیماری سے ہے  
 چھین لیتی ہے یہ تجھ سے رفعت فکر رسا اور کر دیتی ہے گل تیرے تختل کا دیا  
 تو بھی میخانے سے ہستی کے مئے گلغام لے حاصل آیا م ہے، اس زندگی سے کام لے  
 اونٹ سے فاروقِ اعظم کی طرح نیچے اتر غیر کے احسان سے پرہیز کر! پرہیز کر!  
 مانگتا کتبک پھر گما منصب دولت کی بھیک حیف ہے یہ نے سواری مثل طفلانِ رکیک  
 فطرتِ عالی جو ہو نو آسمانوں سے بلند غیر کے احساں ہو جاتی ہے وہ خوار و نشرد  
 ایک نفلس مانگنے سے خوار ہو جاتا ہے اور اور گدائی سے گدا نادار ہو جاتا ہے اور  
 بھیک سے آشفہ ہو جاتے ہیں اجڑا خودی بے تجلی اس سے نخل طور سینائے خودی  
 اپنی ہستی کو نہ کر برباد اے فرخندہ فال! چاند بن اور اپنی روٹی اپنے پہلو سے نکال  
 نکبت و افلاس کتنا ہی نہ تجھ کو گھیر لے اور بد بختی تجھے سیلِ فنا میں ڈال دے

اپنی روزی نعمتِ اغیار سے حاصل نہ کر  
 تا رسول اللہ کے آگے نہ ہو تو منفعل  
 چاند روزی پاتا ہے سوچ کے دستِ خوان سے  
 ہمت حق پر فلک سے برسرِ پیکا رہو  
 گرد سے جس نے بتوں کی پاک کعبے کو کیا  
 حیف اس چرسکی روزی دوسرے کے خوان سے  
 آپ کو جس نے جلایا برق لطفِ غیسر  
 اے خوشا وہ تشنہ جو ہے دہوپ میں بھی شادام  
 مانگنے کی شرم سے ہوتا نہیں جو تر جیس  
 اس جہان آبِ گل میں وہ جوانِ ارجمند  
 جو تہی دستی میں ہو جاتا ہے کچھ خود دار اور  
 بھیک کا قلم نہیں کم آگ کے سیلا سے  
 چشمہ خورشید سے پانی نہ مانگ اے بے خبر!

حشر کے دن حبِ طبری شکل میں ہو لگے جانِ دل  
 داغ رکھتا ہے وہ اپنے دل پر اس حسان  
 تانہ تجھ سے ملتِ بیضا زریل و حوار ہو  
 مرد کا سب کو لقب بخشا حبیب اللہ کا  
 جس کی گردن ہو گئی خم غیر کے احسان سے  
 نقدِ غیرت کو گنوا یا ایک روٹی کے لئے  
 جو خضر سے بھی نہ مانگے پیاس میں پانی کا جام  
 آدمی ہوتے ہوئے جو مشتِ گل بنتا نہیں  
 ناز سے چلتا ہے مانند صنوبرِ مرملند  
 سخت سوتا ہے تو وہ ہوتا ہے کچھ میدا اور  
 خود ملے شبنم تو بہتر گوہر نایاب سے

تو جباب آساگرہ میں غیرت مردانہ رکھ  
بحر میں رہتے ہوئے اپنا لگوں پیمانہ رکھ

اس بیان میں کہ خودی جب عشق و محبت سے مضبوط ہو جاتی  
ہے تو عالم کے قوائے ظاہر و مخفی کو مسخر کر لیتی ہے۔

عالم کون دمکاں پر ہو گئی فرماں روا	حب محبت نے خودی سے زور حاصل کر لیا
یہ خودی کی شاخ سے غنچے کھلے ہیں بے شمار	آسمانوں پر کو اکب کے ہیں جو نقش و نگار
چاند بھی اس کا اشارہ پا کے ہو جاتا ہے شق	اس سے ہوتا ہے ظہور قوت بازو کے حق
سر جھکا دیتے ہیں اس کے سامنے دارا و جم	وہ جہاں کے باہمی جھگڑوں کی بنتی ہے حکم
تھا سوادِ ہند میں نام اس کا روشن بے گمان	آکسناؤں تجھ کو شاہِ بوعلی کی داستاں
وہ گلِ رعنا کی جس نے ہم کو پہنچائی شمیم	وہ کہ تھا اک نشہ میرا بلبلِ باغِ قدیم
اس کے دامن کی ہوا سے ہو گئی مینو سواد	جنتِ ہندوستان بھی اصل میں آتشِ نثار و
اور شرابِ بوعلی کے نشتر میں سرشار تھا	اک مرید اس کا روانہ جانبِ بازار تھا



عامل شہر اس طرف آتا تھا گھوڑے پر سوار  
 اس سے اک چادش نے بڑھ کر کہا اے بے خبر!  
 یہ جھکائے سر یونہی چلتا رہا مرد فقیر  
 جام استکبار سے تھا مست چادش پلید  
 وہ مرید آزرده ہو کر اس جگہ سے چل دیا  
 جا کے اپنے سپر کی خدمت میں فریادی ہوا  
 جس طرح کہسار پر گرتی ہے برق بے پناہ  
 آتش دل نے کیا کچھ اور بھی اس کے سوا  
 لے قلم، اور میں لکھاتا ہوں تجھے فرمان لکھ  
 میرے خادم کو ترے عامل نے کیا مارا عصا  
 ہر طرف کر دے اُسے گر چاہتا ہے اپنا راج  
 مرد حق آگاہ کا جس دم اسے فرماں بلا  
 سینکڑوں جس کی جلو میں تھے غلام و چوہ دار  
 ہندیوں رستہ جلو داران عامل کا نہ کر  
 غوطہ زن تھا اپنے بحرِ فکریں وہ راہ گیر  
 سر پر اس کے کھینچ کر اک چوہ سستی کی رسید  
 پر بہت افسردہ خاطر، ناخوش و دل گیر تھا  
 اور اک سیلابِ شک آنکھوں سے جاری کر دیا  
 سیل آتشِ شیخ کی باتوں سے جاری ہو گیا  
 حکم اس غصے میں اس نے اپنے منشی کو دیا  
 اس فقیر بے نوا سے جانب سلطان لکھ  
 خرم ہستی کو اپنے نذر آتش کر دیا  
 سو نیتا ہوں دوسر کو ورنہ تیرا تخت تاج،  
 جسمِ شہ پر دیکھتے ہی اس کے لرزہ پڑ گیا



اور چہرہ منظرِ آلام ہو کر رہ گیا      زرد مثلِ آفتابِ شام ہو کر رہ گیا  
 پہلے اک زنجیرِ عامل کے گلے میں ڈالی      پھر قلندر سے معافی کے لئے تدبیر کی  
 خسرو ہندوستان، شیریں باں انگلیں بیاں      جس کے نغمے آئینہ دارِ موزِ کن فکان  
 وہ کہ فطرت اسکی روشن تھی مثالِ ماہِ تہا      شہ کی جانب سے ہوا ہر سفارتِ انتخاب  
 بارگاہِ بوعلی میں حبیب ہوا نغمہ سرا      شیشہ جاں کو نوازے درد سے پگھلا دیا  
 شوکتِ درویش جو کھسار سے بھی بچتا تھی      قیمتِ یک نغمہ گفتار ہو کر رہ گئی

مت روار کھنا کبھی آزارِ مردانِ خدا  
 آتشِ سوزاں کا گر چکھنا نہ ہو تم کو مرزا

اس معنی میں کہ نفی خودی کا مسئلہ اقوامِ مغلوبہ کی اختراعات سے ہے۔

جو اس پوشیدہ طریقہ سے اقوامِ غالبہ کے اخلاق کو ضعیف کرتی ہیں۔  
 کیا سنی تو نے کبھی وہ داستانِ دل نشیں؟      بھیڑیں کچھ اک مرغزارِ تازہ میں آباد تھیں  
 کھانسی کی کثرت تھی اور افزائشِ اولاد تھی      اور وہ بھیڑوں کی دنیا فکری سے آزاد تھی

حب غریبوں کا مقدر ہو گیا ناسازگار  
 شیر اس جنگل کے آخران سے واقف ہو گئے  
 جذبِ استیلا ہے قوب کا ہمیشہ سے شعار  
 شیر نے آکے اعلان شہنشاہی کیا  
 کام ہی دنیا میں شیروں کا ہے کیا غیر شکار  
 گو سفند اک ان میں، جو چالاک اور فہید تھی  
 تھی جو بد بختی سے اپنی قوم کی سینہ فگار  
 جب بہت کچھ گردشِ وراں کے شکوے کر چکی  
 وقت پر اپنی حفاظت کے لئے ہر ناتواں  
 بندگی میں بند ہو جاتا ہے جب ہر راستا  
 پختہ ہو جاتا ہے جب دل میں جنونِ انتقام  
 بھیڑنے دل میں کہا، اب چارہ مشکل نہیں!  
 اب ہمارے قلم غم کا کوئی ساحل نہیں!  
 ہو گئیں تیرے ناگہانی کا شکار  
 تاک میں ہر لمحہ شبحِ خون کے لئے رہنے لگے  
 فتحِ مندی کا مرانی، اس کا رازِ آشکار  
 حریت سے بھیڑ کو محسوس نہ کیا کر دیا  
 خون سے ہونے لگا بھیڑوں کے رنگین مغزار  
 کہہ سالی کے سب سے گرگِ باران دیدہ تھی  
 اور شیروں کے مظالم سے بہت زار و نزار  
 آخر اپنے کام کی تدبیرِ محکم اس نے کی  
 کام میں لاتا ہے عقلِ جیلہ گر کو بے گماں  
 قوتِ تدبیر پھیلاتی ہے اپنے دستِ و پا  
 سوچنے لگتی ہے فتنے سینکڑوں عقلِ غلام  
 اب ہمارے قلم غم کا کوئی ساحل نہیں!

بھیڑ کی طاقت کہاں، پائے جو شیر سے نجات  
 غیر ممکن ہے کہ وعظ و پند سے کوئی بشر  
 شیر نر کو بھیڑ کر دینا مگر آسان ہے  
 پہلے اپنے آپ کو شیروں کا پیغمبر کہا  
 اس قدر خائف ہے کیوں اے قوم ظالم کینہ و  
 غور سے سن مایہ دار دولت ایمان میں  
 دیدہ بے نور کی آیا ہوں بن کر روشنی  
 جلد ان ناپاک کاموں سے گزر رہا ہے  
 تند و زور آور تو ہوتا ہے زیاں کار و شقی  
 پاک و حوں کی ہے ناداں لگھانس اور چارہ غذا  
 تیزی و دناں تجھے رسوا کرے گی ایک دن  
 ناتوانوں کا، ضعیفوں کا ہے جنت مستقر  
 آہ وہ فولاد باز و اور نازک اپنے ہات  
 گو سفندوں کو سکھائے خوتے گر گہ کینہ و  
 شیر کو چاہے بنانا بھیڑ، وہ نادان ہے  
 پھر زراہ پند ان سے اس طرح جا کر کہا  
 بے خبر ہے تو عذاب روز محشر سے مگر؟  
 اور شیروں کے لئے پیغمبریز دان میں  
 میں تمہارا پیشوا یعنی خدا کا ہوں نبی  
 اے زیاں اندیش افکر نفع کرنا چاہئے  
 زندگی اپنی بنانی ہے تو چھوڑ اپنی خودی  
 چھوڑ دے جو گوشت کھانا ہے وہ مقبول خدا  
 دیدہ بیدار کو اعمیٰ کرے گی ایک دن  
 باعث نقصان ہے قوت، ہوش میں آ بے خبر!

ہے تلاشِ عظمت و دولت سرا سر شور و شر  
 گھات میں دانے کی کب ہتی ہے بھلی بے شعور  
 ذرہ بن، صحرانہ بن گر عفل و دانش ہے تجھے  
 ذبح کر گئے گو سفندوں کو ہے کیوں نازاں بھلا!  
 زندگی کو تیری کرتا ہے بہت ناپائدار  
 سبزہ پامال دیکھا سبز ہوتے بار بار  
 غافل اپنے آپ سے ہو جا، اگر فرزانہ ہے  
 چشم و گوش و لب کو اپنے بند کراے ارجمند  
 یہ علف زار جہاں کچھ بھی نہیں! کچھ بھی نہیں!!  
 سخت کوشی تھی گراں شیرانِ خوں شام پر  
 آگئی فوراً انھیں یہ پند خواب آور پند  
 حیف جو کرتا تھا پہلے گو سفندوں کا شکار  
 تنگدستی ہے امارت سے جہاں میں خوب تر  
 دانہ ہو جائے اگر خرمن تو ہے اس کا قصور  
 تانیا تے مہر عالم تا بے حصہ ملے  
 ذبح کر خود کو کہ اے ناداں! یہ ہے رتبہ بڑا  
 تیرا یہ جو رستم، یہ انتقام و اقتدار  
 گردِ خوابِ مرگ کو آنکھوں سے دہوتے بار بار  
 اور اگر تو آپ سے غافل نہیں دیوانہ ہے  
 تاکہ ہو تیرا تختیں ہم سر چرخ بلند  
 یہ خیالی چیز ہے دہوکا نہ کھالے بے یقیں!  
 کر چکا تھا دل میں ذوقِ تن پرستی اپنا گھر  
 کھا گئے وہ اپنی خامی سے فریبِ گو سفند  
 کر لیا اب اس نے دین گو پسندی اختیار



سازگار آئی جو شیروں کو چپا گاہ علف  
 ہو گیا بالآخر ان کا گوہر شیریں خزن  
 گھانس سے وہ تیزی دنداں بھی رخصت ہو گئی  
 ہمیت چٹم شرار افشاں بھی رخصت ہو گئی  
 آہ پہلو میں نہ کچھ دل کا اثر باقی رہا  
 آئینے سے جو ہر آئینہ رخصت ہو گیا  
 دل سے وہ جوش جنون کوششِ کامل گیا  
 وہ تقاضائے عمل، خطر طریق دل گیا  
 اقتدار و عزم و استقلال رخصت ہو گیا  
 اعتبار و عزت و اقبال رخصت ہو گیا  
 پنجہ ہائے آمہنی بے زور ہو کر رہ گئے  
 مر گئے دل، تن سرا سر گور ہو کر رہ گئے  
 زورِ تن جب گھٹ گیا تو خوفِ جاں پیدا ہوا  
 خوفِ جاں پیدا ہوا، سرمایہ ہمت گیا  
 ہو گئے صدمہ مرض پیدا، جو ہمت ہار دی  
 بیدلی، کوتاہ دستی اور کمی نہ فطرتی  
 بھڑکے افسوں سے آخر سو گیا شیرِ ثریاں

اور تنزل پر ہوا تہذیب کا اس کو گماں

اس معنی میں کہ افلاطون یونانی، کہ تصوف اور اقوام اسلامیہ کے ادبیات  
 نے اس کے افکار سے بہت زیادہ اثر قبول کیا ہے۔ مسلکِ گوسپندی پر

گم زن تھا اس لئے اس کے تخیلات سے بچنا واجب ہے۔

تھا جو سرتاجِ گردہ گو سپندان قدیم	راہبِ دیرینہ، وہ مشہور افلاطون حکیم
اور کوہستانِ بہت و بود ہی کا ہو رہا	جس کا گھوڑا ظلمتِ معقول میں گم ہو گیا
اعتبار اپنے ہی اعضا کا نہیں باقی رہا	اس پر افسوں چل گیا تھا الیانا محسوس کا
شمع کے بجھنے میں آئے اس کو سوجھوئے نظر	زندگی کا راز مرنے میں بت یا مستتر
جام ہے اس کا بڑا خواب اور ودانشِ رُبا	ہو چکا ہے وہ ہماری فکر پر فرماں روا
حکم اس کا گردن صوفی میں ہے مثلِ کند	درحقیقت ہے لباسِ آدمی میں گو سفسد
عالمِ اسباب کو ظالم نے افسانہ کہا	ماورائے چرخ اپنی عقل کو پہنچا دیا
کاٹ ڈالی اس نے شاخِ سرورِ عنایات	کام تھا اس کا فقط تحلیلِ اجزائے حیات
’بود کونا بود بتلاتی ہے اس کی عقلِ خام	فکرِ افلاطون نے رکھا ہے زیاں کا سود نام
اس کی چشمِ ہوش نے پیدا کیا ہے اک سرب	اس کی فطرت سو گئی جس دم تو دیکھا ایک رخِ اب
اس لئے سوجاں و دل سے عاشقِ محرم تھا	لذتِ سعی و عمل سے لبکہ وہ محروم تھا



تھا جہاں میں منکر پہنکا مہِ موجود وہ      بن گیا تھا خالقِ اعیانِ نامشہود وہ  
 زندہ دل کے واسطے یہ عالم امکان ہے خوب      مردہ دل کے حق میں جیسے عالمِ اعیان ہے خوب  
 اس کے آہونے گنوا یا معرفت میں لطفِ حرام      لذتِ رفتار اس کے سہنس پر بالکل حرام  
 اس کی شہم میں نہ تھا کچھ طاقتِ رم کا نشان      اس کے طائر کا تھا سینہ دم سے خالی بے گمان  
 اس کا دانہ لذتِ روئیدگی سے بے خبر      اور تڑپنے کا نہیں پردا نے ہیں اس کے اثر  
 پاس اس کے ترکے دینا کے سوا چار نہ تھا      کیونکہ اس غوغائے عالم کا اُسے یار نہ تھا  
 سنجہ افسردہ کی الفت میں ہارا اپنا دل      اور افیون خوردہ دینا سے لگا یا اپنا دل  
 آشیائے کو چھوڑ کر الیاس کو گردوں اڑا      سرخ نہ پھرا اپنے نشین کی طرف اس نے کیا  
 ہاں خیال اس کا خمِ گردوں میں جا کر گم ہوا      یہ نہیں معلوم تلچھٹ یا کہ خشتِ خم ہوا

قوم اس کے نشے سے مسموم ہو کر رہ گئیں

لذتِ اعمال سے محروم ہو کر رہ گئیں

حقیقتِ شعرا و اصلاحِ ادبیاتِ اسلامیہ کے بیان میں۔

گرمِ روانِ انسان کو رکھتا ہے داغِ آرزو      خاک کو آتش بناتا ہے چراغِ آرزو  
 آرزو سے زندگی کا، مے سے ہے لہریز جام      آرزو سے زندگی ہے گرم خیز و تیز گام  
 زندگی تسخیر کا مضمون ہے اور کچھ بھی نہیں      آرزو تسخیر کا افسوں ہے، اور کچھ بھی نہیں  
 زندگی صیاب ہے اور اس کا ہے دامِ آرزو      حسن کو عاشق کی جانب سے ہے پیغامِ آرزو  
 دل میں آخر کس لئے ہوتی ہے پیدام بدم      آرزو۔ یعنی نوائے زندگی کا زیرو ہم  
 جو بھی ہے دنیا میں زیبا و جمیل و خوشنما      ہے بیابانِ طلب میں وہ ہمارا رہنما  
 نقش تیرے دل میں جس کا بیٹھتا ہے استوار      آرزو کرتا ہے تیرے دل میں پیدا بار بار  
 حسن ہے دنیا میں خلاق بہارِ آرزو      جلوہ زارِ حسن ہے پروردگارِ آرزو  
 سببِ شاعر ہے دنیا میں تجلی زارِ حسن      سینہ شاعر سے پیدا ہوتے ہیں انوارِ حسن  
 وہ بن جاتا ہے شاعر کی نگہ سے خوب تر      اس کے افسوں سے ہے فطرت کی نوا محبوب تر  
 اس کے دم سے باغ میں سکھی ہے بلبل نے نوا      اور اسی کے غانے سے خسارِ گل روشن ہوا  
 یہ اسی کے سوز کی تاثیر پر و انوں میں ہے      اور اسی کا رنگ یہ الفتِ افسانوں میں ہے

بحر و برکی و سعیتیں پوشیدہ اس کے گل میں ہیں  
 ذہن میں اس کے ہزاروں بے اُگے لالے بھی ہیں  
 ہم لشینِ ماہِ و انجم اس کی تحفہ رسا  
 خضر ہے غلغات میں اس کی نہاںِ چیات  
 ہم جو بے حد سست رو، نا پختہ کارِ سادہ ہیں  
 اس کا بیل اس گلستاں میں نوا پیرا ہوا  
 تاکہ دکھلائے ہمیں لے جا کے فردوسِ جیات  
 چلنے لگتے ہیں یہاں اس کی دراپرِ قافلے  
 وہ ہمارے گلستاں کے واسطے موزِ صبا  
 اس کی ترغیبوں سے بنتی ہے خود افزا زندگی  
 احتسابِ خوشنمائی میں ناشکیبا زندگی  
 شو جہاں تازہ صفا اس کے آب و گل میں ہیں  
 ناشیدہ سینکڑوں نغمے بھی ہیں، نالے بھی ہیں  
 خوب کا خالق ہے، وہ اور زشت سے نا آشنا  
 زندہ تر اشکوں سے اس کے گلستاں کا نبات  
 راستے میں منزلِ مقصود کے اقتدارہ ہیں  
 ادراکِ حیلہ ہمارے واسطے پیدا کیا  
 حلقہ بن جائے مکمل، بڑھکے یہ قوسِ حیات  
 رقص کرتے جاتے ہیں اس کی نوا پرِ قافلے  
 وہ ہمارے لالہ و گل کو نسیمِ جاں فزا  
 اپنے دستِ خوان پر دیتا ہے عالم کو صلا  
 کرتا ہے ارزاں وہ اپنی آگ کو مشعل ہوا



جیف ہے اس قوم پر جو موت سے ہو بہرورد  
 اور شاعر اس کا ذوقِ زندگی سے بے خبر  
 رشت رو کو آئینہ اس کا دکھا کے خوشنما  
 شہد میں اس کے چھپا ہوز ہر شتر سے سوا  
 اس کا بوسہ چھین لے رخسار گل سے تازگی  
 لوٹ لے بلبل کے دل سے لذتِ پرداز بھی  
 مست کر ڈالے تیرے اعصاب کب اس کی افیم  
 مار کر رکھ دیں تجھے اس کے خیالاتِ ستیم  
 اس کے دم سے ذوقِ رعنائی ہے بے پروہڑ  
 اور دم سرو اس کا شاہین کو بنانا ہے تدر  
 ایسی مچھلی، جو کہ ہے سینہ سے سترک آدمی  
 اور نہایت آشیایاں کی طرح دریا میں مچھلی  
 تا خدا کو راگ سے بے خود بنا دیتی ہے جو  
 اس کی کشتی کو تہ دریا سلا دیتی ہے جو  
 جس کے نغمے تیرے دل سے لوٹ لیتے ہیں ثبات  
 موت گھو جس کے جادو سے سمجھتا ہے حیات  
 زلیت کی خواہش جدا کرتا ہے تیری جان سے  
 نعلِ غنبل چڑا لیتا ہے تیری کان سے  
 وہ دکھاتا ہے زیاں کی شکل میں ہر سود کو  
 اور بنا دیتا ہے وہ مذموم ہر محسود کو  
 فکر و اندیشہ کے دریا میں گرا دیتا ہے وہ  
 اور عمل سے تجھ کو بیگانہ بنا دیتا ہے وہ  
 وہ خراب و خستہ اس کے شعر سے ہم خستہ حال  
 اس کے دورِ جام سے یہ بزمِ عالم خستہ حال

اس کے نیساں میں کبھی سبلی نہیں دیکھے گا تو      باغ ہے اس کا حقیقت میں سرابِ نگِ لبو  
 حسن میں اس کے صداقت کا نہیں نام و نشان      ہیں بہت بے آب مونی اس کے دریا میں نہاں  
 خواب کو سمجھا ہے بیداری سے ظالم خوشنما      اپنے دم سے آگ کو سینوں میں ٹھنڈا کر دیا  
 اس کے بیل کا ترنم زہر سے قاتلِ سوا      اس کے پھولوں کے تلے سویا ہوا ہے آزدیا

ہیں ہلاکت آفریں اس کے خم و مینا و جام  
 زہر سے کچھ کم نہیں اس کی مے آئینہ فام

اے کہ تو اس کی شرابِ ناب سے خستہ جگر      اے کہ اس کے مشرقِ مینا سے ہے تیری سحر  
 اس کے نعموں سے ترا دل جوش سے ٹھنڈا ہوا      کان کے رستے سے تو نے زہرِ قاتلِ پی یا  
 اے کہ لپٹی کی طرف رہبرِ ترا انداز ہے      اور تہی مایہ نوا سے تیرا تارِ ساز ہے  
 اس قدر اپنی تن آسانی سے زار و ناتواں !      دہریں تنگِ مسلمانی ہے اب تو بے گماں  
 باندھ سکتی ہے رگِ گلِ تجھ کو اے مردِ سلیم !      خستہ و مجروح کر سکتی ہے اک موجِ نسیم !  
 عشق ہے رسوا زمانے میں تری فریاد سے      زشت رو تو صوبی ہے اس کی تھے ہزار سے

اس کا پہرہ زرد ہے ظالم تمہے آزار سے      تیری سردی سے ہے وہ محروم سوزنا ر سے  
 خستہ جاں وہ ہو گیا ہے خستہ جانی سے تری      ناتواں وہ ہو گیا ہے ناتوانی سے تری  
 گریہ طفلانہ پہا نے میں اس کے رہ گیا      کچھ نہیں اب اس کے گھر میں آہ و نالہ کے سوا  
 بھیکے سے بھانے کی سرشار رہتا ہے مدام      روزن کا شانہ سے جلوے چرانا اس کا کام  
 غمزدہ ہے اور افسردہ ہے اور آذر دہ ہے      اور دیباہوں کی ٹھوکر سے بچارہ مردہ ہے  
 ہو گیا ہے وہ غموں سے سوکھ کر مانند نے      آسمان کے ظلم سے ہر وقت لب پر شکوہ ہے  
 مکر و کینہ آج اس کا جوہر آئینہ ہے      ناتوانی، لا غری اک ہمدرد دیرینہ ہے  
 عشق پہ اور لپٹ بخت و زیر دست و دوں نہا دا      عشق ہے اور نا سزا فنا امید و نا مراد !  
 اس کے شبیوں نے کیا ہے تیرا نقد جاں خراب      اس کے نالوں نے اُڑا یا چشم ہمایہ سے خوا

حیف ایسے عشق پر ہے جس کا شعلہ بجھ گیا

کعبے میں پیدا ہوا بت خانے میں جا کر مرا

اے کہ تو رکھتا ہے اپنی جیب میں نقد سہن      رکھ عیار زندگی پر اس کو لمبے مخدوم من



فکر روشن بین ہے دنیا میں غسل کی رہنما	جیسے بجلی کی چمک دیتی ہے بارش کا پتا
فکر صالح چاہئے، گر بے تجھے شوق ادب	فکر صالح کلمے لئے پھر لوٹ آسکے عجب
عشقِ سلیمانے عرب میں دل کو کرپن نیاز	تا کہ شامِ کر دے پیدا ہو پھر صبح حجاز
تو نے گل چینی چمن زارِ عجم کی خوب کی	خوب تو نے نو بہارِ ہند و ایراں دیکھ لی
گرمی صحرا کا بھی تھوڑا سا حاصل کر مزا	بادِ دیرینہ خزا بھی لے چکھ لے ذرا
دیکھ تھوڑی دیر اس کی راحتِ آغوشِ گرم	اس کی گرم آندھی میں بھی لے چل ذرا یہ جہنم
مدنوں تو ریشم و سنبال میں لوٹا کیا	آپ کو کر پاس کی سختی کا بھی خوگر بنا
تو نے سیرِ گلستاں میں قرن کھوئے ہیں بہت	اپنے عارضِ مثلِ گلِ شبنم سے دھوئے ہیں بہت
خود کو اب تو ریگِ سوزاں پر بھی چل کر آزا	کچھ دنوں اب چشمہ زمزم میں بھی غوطے لگا
مثلِ بلبلِ نالہ و شیون کر گیا کب تلک!	ان چمن زاروں میں تو آخر ہے کاکب تلک!
اے، ہوا بھی تیرے کمنِ دام سے ہے ارجمند	آشیانہ تو بنا اپنا سرِ کوہِ بلند
آشیانہ برق کے پہلو میں ہونا چاہئے	شاہِ بازوں کے نشین سے بھی اونچا چاہئے

تاکہ تو ہو جائے مردِ کارزارِ زندگی  
شعلہ زن ہو جسم و جاں میں شریے تارِ زندگی

اس بیان میں کہ تربیت خودی کے تین مرحلے ہیں۔ اول کو اطاعت  
دوسرے کو ضبطِ نفس اور تیسرے کو نیابتِ الہی کہتے ہیں۔

## مرحلہ اول اطاعت

نہ خدمت سے خوش رہتا ہے کیا بچاؤ اٹا	صبر و استقلال کی دینا کا ہے ہر کارہ اٹا
نور قدموں کا نہیں کچھ راہ جب چلتا ہے وہ	کارواں کے واسطے اک کتتی صحرا ہے وہ
نش پا ہے اس کا ہر جگہ کی قسمت میں لکھا	کم خور و کم خواب، اور محنت سے اس کو واسطا
ست ہے وہ، خواہ زیر بارِ محمل کیوں ہو	خوش چلا جاتا ہے وہ، کیسی ہی منزل کیوں ہو
مہر خوش و سرشار ہے کیفیتِ رفتار سے	اور سفر میں صابر و قانع سوا آسوا سے
نوبھی سرتابی بونہی اپنے فرائض سے نہ کر	تاکہ لطفِ عندہ حسن المآب آئے نظر

کی طاعت میں ذرا کوشش کرائے غفلت شعراً  
 طاعت معبود سے ناکس بھی ہو جاتا ہے کس  
 مگر تو سکتا ہے شکار ماہ و پرویں تو، مگر  
 گل کے ننڈاں ہانہ میں رہ کر ہوا خوشبو بنی  
 جانبِ منزل رواں ہے انجم سیما ب پا  
 سبزہ؛ جو پیدا منو کے دین و آئیں پر ہوا  
 منقل چلنا ہے حبِ قانونِ لالہ بے گماں  
 قطرے دریا بن گئے ہیں، مہل کے آئین سے  
 حب کہ آئیں سے ہر اک شے کا قوی دل ہو گیا  
 تو بھی آزاد اے مسلمان! اپنے آئیں سے نہو  
 جبر کر اپنے پتہ تا حاصل ہو تجھ کو اختیار  
 سرکشی سے آگ کو دیکھا ہے ہوتے ہم نے خس  
 پہلے اپنے آپ کو آئین کا پابند کر  
 اور پو پابند ہو کر نافِ آہو بنی  
 کس قدر پابند ہے چلنے میں وہ آئین کا  
 ترک یہ آئین کیا، پا مال ہو کر رہ گیا  
 کس قدر اس کی رگوں میں خوش رہتا ہے واں  
 ذرے صحرا بن گئے ہیں، وصل کے آئین سے  
 پھر تولے نادان کیوں آئین سے غافل ہو گیا  
 زینتِ گردن بنالے پھر اسی زنجیر کو

شکوہ سنجِ سختی آئین نہوائے بے عمل  
 اور حدودِ مصطفیٰ سے اس طرح باہر نہ چل



## مرحلہ دوم۔ ضبط نفس

نفس ہے کس درجہ خود پرور تر ایشل شتر!  
 مرد بن کر ہاتھ میں لے اپنے تو اس کی مہار  
 جو نہیں ہوتا ہے اپنے آپ پر فرماں روا  
 آب و گل سے تیرے پیکر کی کھی جس دن بنا  
 خوفِ عقبی، خوفِ دنیا، خوفِ ایماں، خوفِ جاں  
 حبِ دولت، حبِ جاہ و مصیبتِ وطن  
 امتزاجِ آب و گلِ نثر پروری کی ہے دلیل  
 ہاتھ میں حب تک ہے تیرے عصا لا الہ  
 جس تن نازک میں حق کے زور جاں پڑ گئی  
 خون کو سینے میں اس کے راستہ ملتا نہیں  
 خود سری خود پرستی سے ہے اس کا سینہ پُر  
 تاکہ اس دنیا میں قائم ہو ترا عز و وقار  
 وہ ہوا کرتا ہے تابع دوسروں کے حکم کا  
 خوفِ دالفت کو نری تعمیر میں اخل کیا  
 خوف کیسے! خوفِ آلامِ زمیں و آسماں  
 حبِ فرزند اور حبِ اقربا و حبِ زن  
 گشتہ منکر ہمیشہ اور فحشا کا قتل  
 ہر طلسمِ خوف کو باطل بنا سے لا الہ  
 اس کا سراپا مل کے آگے جھک نہیں سکتا کبھی  
 یعنی اس دل میں غیر اللہ کا کھٹکا نہیں

خوش ہے وہ، اقلیم لائیں جو کوئی آبا ہے  
کیا زن و فرزند ہر اک فکر سے آزاد ہے  
ماسوا سے اس قدر کرتا ہے وہ قطع نظر  
راہ میں حق کی گوارا اس کو ہے زنج پسر  
ہے اکیلا وہ سچوم فوج و لشکر پر گراں  
جان بھی ارزاں سے اس کو مثل باد بکراں  
لالہ ہے اک صدف اور اس کا گوہر ہے نماز  
اور دل مسلم کے حق میں حج اصغر ہے نماز  
ہاتھ میں مسلم کے یہ شمشیر خوں آشام ہے  
قتلِ فحشا نہی و منکر بس اسی کا کام ہے  
روزہ درماں ہے پیاس اور بھوک کے امراض کا  
خیبر تن پروری کو توڑتا ہے ہر مٹلا  
فطرتِ مومن جلا پاتی ہے حج کعبہ سے  
ایسی طاعت، جو کہ اک سرمایہ جمیعت کا ہے  
حربِ دولت کو زکوٰۃ مال کرتی ہے فنا  
جس سے قائم ربط باہم فرد اور ملت کا ہے  
اور بناتی ہے مسلمان کو مساوات آشنا  
اور حتیٰ الفقہوا سے دل کو کرتی ہے قوی  
زر کی افزائش ہے اس، الفتِ زر کی کمی  
واسطہ ترے یہ سب کچھ وجہ استحکام ہے  
پختہ ہے تو بھی، اگر محکم نہرا اسلام ہے

یا قوی کے ورد سے رکھ اپنی طاقت برقرار  
تاکہ تو اس اُشترِ خاکی کا ہو جائے سوار



## مرحلہ سوم۔ نیابت الہی

ہو گیا تو اپنے خاکی اونٹ پر جس دم سوار  
تو جہاں آرا رہے گا حبِ تلکے یہ جہاں  
اس جہاں میں نائبِ حق بن سکے یہنا خوبے،  
حق کا نائب بالیقین ہوتا ہے اس عالم کی جاں  
اس کو ہوتی ہے رموزِ جزو و کل پر آگہی  
عرصہ عالم میں جب کرتا ہے وہ خیمہ بپا  
وہ نمائش چاہتا ہے فطرتِ محمور کی  
یہ جہاں کیا! سینکڑوں ایسے جہاں جزو و کل  
ہم اس کا پے کرے وہ پختہ ہر اک خام کو  
نارِ دل مضرب ہے اس کی ہمیشہ نغمہ زنا  
تیرا سرتاج سلیمانی سے ہوگا تاج دار  
ملکِ لایلا کا سر پر تاج ہوگا بے گماں  
حکمِ راں ہونا عناصر پر بہت محبوب ہے،  
ہے جہاں میں اس کی ہستی ہم غلم کا نشان  
اور خدا کے حکم پر چلنا ہے اس کی زندگی  
ختم کر دیتا ہے قصہ اس بساطِ کہنہ کا  
خود بنا لیتا ہے اپنے واسطے دنیا نئی  
اس کی کشتِ فکر سے ہوتے ہیں پیدا مثلِ گل  
اور بیت اللہ سے باہر کرے اصنام کو  
حق کی خاطر اس کا سونا، حق کی خاطر جاگنا

وہ بڑھاپے کو سکھا دیتا ہے آہنگِ شباب  
 اور بھروتا ہے ہر اک چیز میں رنگِ شباب  
 ذات ہے اس کی بشیرِ نوحِ انساں اور نذیر  
 اور سپاہی بھی، سپہ سالار بھی ہے اور امیر  
 مدعا ہے علمِ لاسما راسی کی ذات ہے  
 سرِ سبحان الذی اسریٰ اسی کی ذات ہے  
 اس کا روشن ہاتھ یاری عصا ہے قوی  
 قدرتِ کامل صفت، ایک افسانہ علم کی  
 ہاتھ میں لیتا ہیں کی ہلک جُبِ شہسوار  
 اور ہو جاتا ہے چابک یہ سمندر روزگار  
 اس کی ہیبت خشک کر دیتی ہے روئیل کو  
 مصر سے لیکر نکل جاتا ہے اسرائیل کو  
 اس کی قلم سے گورتن میں زندہ ہو جاتی ہے جاں  
 جس طرح سرو و صنوبر درمیان گستاں  
 ہے جہاں کے واسطے توجہ محکم اس کی ذات  
 اس کا سایہ ڈرے کو کرتا ہے خورشیدِ آشنا  
 اپنے اعجازِ عمل سے بخشتا ہے زندگی  
 اس کے نقشِ پاسے جلوے ہوتے ہیں پیدا ہزار  
 زندگی کی وہ بیان کرتا ہے تفسیریں نئی  
 اور خوابِ زلیت کی کرتا ہے تعبیریں نئی

درحقیقت اس کی ہستی زندگی کا راز ہے  
 اور سائر زندگی کی اک عجب آواز ہے  
 طبع موزوں بند فطرت خون ہو جاتی ہے  
 تب کہیں اک بیت اسکی ذات کی بن آتی ہے  
 اپنی مشت خاک جا پہنچتی ہے اگے دوں کے پار  
 اس غبارِ تیرہ سے پیدا ہو شاید وہ سوا  
 اپنی اس خاکسترِ امروز میں اے باصف!  
 شعلہ فردائے عالم سوز ہے سو یا ہولہ  
 اپنے غنچے میں ہے پوشیدہ بہارِ گلستاں  
 شہسوارِ اشہبِ دوراں! خدا را جلد آ  
 آنکھ کو رکھتا ہے روشن صبح فردا کا سماں  
 اے خدا را رونق ہنگامہ ایجاد ہو  
 لے فرغ دیدہ امکاں! جمال اپنا دکھا  
 آ، کہ پھر یہ شورِ شِ اقوام ہو جائے خموش  
 اور آنکھوں میں ہماری آنکے تو آباد ہو  
 آ، کہ قانونِ اخوت پھر جہاں میں عام ہو  
 اپنے نغموں کو بنائے آنکے تو فردوسِ گوش  
 بادۃ الفتن کا ہر اک دل چھلکتا جام ہو  
 جنگ کے شیلائیوں کو آکے دے پیغام صلح  
 کاروانِ زندگی کے واسطے منزل ہے تو  
 آ، ہمارے باغ میں لے باغِ عالم کی بہار  
 کچھ نہیں چھوڑا گلستاں میں خزاں نے برگِ با



سینکڑوں سجدے جو انوں پر پڑھو چکے ہیں کے آہماری شمرگیں پشانیوں سے نذر لے

پہلے تیری ذات سے مل جائے ہم کو اعتبار

پھر جہاں کے سونے سے ہو جائیں گے ہم سازگار

## اسماء علی مرتضیٰ کے اسرار کی شرح میں

مُسلم اول، ولی حق، شہ مردانِ علیؑ

العت صارق سے اس کے دو دماں کی زندہ ہو

نرگس خیراں ہوں میں دارفتہ نگار ہوں

زمزم ابلے میری مٹی سے تو ہے اس کا کرم

خاک ہوں، اسکی محبت سے مگر آئینہ ہوں

دیکھ کر اس کی طرف حضرتؐ نے یہ فرما دیا

اور فرمایا کہ ہے یہ قوتِ دینِ مبین

عشق و الفت کے لئے سرمایہ ایمان علیؑ

اس محبت ہی سے میں مشلِ گہر تابندہ ہوں

بوئے گل کی طرح اس کے باغ میں آوارہ ہوں

اور مجھے انگوٹے سے ٹپکے جوئے اس کا کرم

دیکھ لو آوازِ سینے میں، وہ روشن سینہ ہوں

ملت بیضا کا اس سے دیدہ بہ بالا ہوا

آل سے اس کی منور عکس گے دُنیاء اور دین

حق نے فرمایا، ید اللہ! اس شہ بد ہے کتاب  
 جان سکتا ہے وہی اسرارِ اسماءِ حسنیٰ  
 عقل جس کے ظلم سے ہے مبتلائے مددِ محن  
 آدمی کو پہرا اور اندھا بنا دیتی ہے جو  
 سالکانِ راہِ حق جس سے زبوں ہستہ جگر  
 کر دیا اس خاک کو روشن مثلِ آئینا  
 ہو گیا اقلیمِ تن کو فتح کر کے، بو تراب  
 اس قدر اس کے گھر کی آبِ خود داری سے ہے  
 پھر کر لے آئے مغرب کی طرف سے آفتاب  
 خاتمِ دولت پہ بیٹھا ہے وہی مثلِ نیکیں  
 اُس جہاں میں ہاتھ اس کا قاسم کو ٹر بے  
 اور یدِ الہی کی قوت سے شہنشاہی کرے

مرسلِ حق نے لقب اس کو دیا ہے، بو تراب  
 جانتا ہے جو کوئی دنیا میں رازِ زندگی  
 وہ سیّدِ تاریخ مٹی نام ہے جس کا بدن  
 فکرِ عالی کو زمیں پہما بنا دیتی ہے جو  
 ہاتھ میں جس کے ہوس رانی کی شمشیر و سر  
 اپنا تابع اس کو جب شیرِ خدا نے کر لیا  
 مرتضیٰ، تلوار سے جس کی ہوا حق کا میاب  
 وہ جہاں میں مردِ کشور گیرِ کراری سے ہے  
 اس طرح دنیا میں ہو جائے جو کوئی بو تراب  
 اس پتن پر جسے باندھا ہے یہاں مضبوط زین  
 ہے شکوہ خیر اس عالم میں پیروں کے تلے  
 وہ خود آگاہی کی دولت سے یدِ الہی کرے



اس کی ذات پاک ہے ”دروازہ شہر علوم“  
 تابع فرماں بنالے تو بھی اپنی خاک کو  
 خاک ہو جانا تو ناداں! مذہب پروانہ ہے  
 سخت ہو پتھر سا اے گل کی طرح نازک بدن  
 زبر فرماں اسکے ہیں چین و حجاز و شام و روم  
 تا ترے انگور سے پیدا شراب ناب ہو  
 خاک ہو جانا تو ناداں! مذہب پروانہ ہے  
 سخت ہو پتھر سا اے گل کی طرح نازک بدن  
 باپ بن اس خاک کا، یہ شیوۂ مردانہ ہے  
 تاکہ قائم تجھ سے ہو بنیاد دیوارِ حِسن  
 خاک سے تیری بنے انسان، وہ تدبیر کر  
 گر بنائے گا نہ تو اپنے لئے دیوار و در  
 اے کہ جو آسمان ہے بہت بیزار و تنگ  
 بے خبر ایہ نالہ و فریاد و ماتم کب تلک!  
 کوششِ بہم میں پوشیدہ ہے مضمونِ حیات  
 اٹھ کمر بھراک بارِ خلاق جہاں تازہ ہو  
 لذتِ تخلیق ہے دراصل قانونِ حیات  
 آگ میں گر کر، چن آر خلیل آوازہ ہو  
 کیا یہ میدان میں سپر انداز ہو جانا نہیں!  
 ہوتی ہے اس موافق گردشِ لیل و نہار  
 جو کوئی اپنی خودی سے ہے جہاں میں پختہ کا

اور اگر ہوتا نہیں اس کے موافق یہ جہاں  
 کھود کر رکھ دیتا ہے بنیادِ موجودات کو  
 ڈھالتا ہے طرزِ نو میں گردِ شسِ ایام کو  
 اپنی قوت سے وہ کرتا ہے جہاں میں آشکار  
 اُڑتا ہے جہاں میں صاحبِ قلبِ سلیم  
 ہے مزا الفت کا دشواری میں اے مردِ عقل  
 قوتیں رکھتے ہیں پوشیدہ بہت مردانِ کار  
 اور کم ظرفوں، کمینوں کا ہے شیوہ دشمنی  
 زندگانی ہے جہاں میں قوت و سطوت کا نام  
 عفو بڑھا ہے دلیلِ سردیِ خونِ حیات  
 کاہلی سے جو کوئی قعرِ مذلت میں رہا  
 ناتوانیِ زندگی کی راہِ کارہ زن ہے دیکھ  
 جنگ کرتا ہے وہ دورِ آسماں سے بے گماں  
 اور عطا کرتا ہے اک ترکیبِ نوذرات کو  
 اور بدل دیتا ہے یکسر چرخِ نیلی فام کو  
 وہ زمانہ، جو طبیعت سے ہو اس کی سازگار  
 کر کے اپنے زور کو صرف مہماتِ عظیم  
 پھول چٹنا آگ کے شعلوں سے مانندِ خلیل  
 جن کو کرتی ہے فقط مشکل پسندی آشکار  
 ہے اسی آئین پر موقوف ان کی زندگی  
 اور سرمایہ ہے اس کا ذوقِ استیلا و تمام  
 دافع و ارسکتہ اس سببیتِ موزونِ حیات  
 ناتوانی کا قناعت نام اس نے رکھ لیا  
 اور کم خوف و ریا سے اس کا البستن ہے دیکھ

اس کا باطن ہے مکارم اور فضائل سے تہی  
 ہوشیار و باخبر! اے صاحب عقل سلیم!  
 گر بصیرت تجھ کو سائل ہے فریب اس کا نہ کھا  
 اس کی سورت کو خرد مندوں نے پہچانا نہیں  
 رحم اور نرمی کبھی بنتی ہے اس کی پردہ دار  
 اس کا پردہ ہے کبھی مجبوری و بے چارگی  
 جب کہ تن آسانی کی صورت میں یہ ظاہر ہوا  
 اور توانائی جہاں بھی ہے صداقت ساتھ ہے  
 زندگی ہے کشت زار اور اس کا حاصل زور ہے  
 مدعی، قوت کا جو دنیا میں مایہ دار ہے  
 زور سے ہوتی ہے باطل میں بھی پیدائش حق  
 اس کی کن سے زہر ہو جاتا ہے کوثر کی مثال  
 شیر سے اس کے ذائقہ کو ہے حاصل فرہر  
 بیٹھتا ہے سینکڑوں گھاتوں میں یہ پُرفتن غنیم  
 مثلِ حربازنگ ہر دم اس کا ہے بدلا ہوا  
 کیونکہ بے پردہ کسی کو یہ نظر آتا نہیں  
 اور کبھی یہ اور ڈھلپتا ہے ردا کے انکسار  
 اور نقاب اس کا کبھی معذوری و بے مایگی  
 صاحب قوت کا دل بھی ہاتھ سے جاتا رہا  
 ساری خوبی دین اور دنیا کی اس کے ہاتھ ہے  
 بلکہ تفسیرِ موزِ حق و باطل زور ہے  
 اس کا دعویٰ بے نیازِ حجت و تکرار ہے  
 قوتوں سے اپنی کر دیتا ہے میہِ بطلان حق  
 خیر کو کہہ دے جو شر ہو جا شر بے قیل و قال



آہ آدابِ امانت سے ہوا وہ بے خبر جس کو خالق نے بنایا دو جہاں سے خوب تر  
 ایسا ناواقف نہ رہ تو زندگی کی راہ سے اے مسلمان اظالم و جاہل ہو غیر اللہ سے  
 اے برادرِ حشمت و گوش و لب تو اپنے کھول دے  
 مجھ پہ سنس لینا جو راہِ حق نہ مل جائے تجھے

حکایت ایک نوجوانِ مروزی کی جو حضرت سید مخدوم علی  
 ہجویریؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ظلم اعدا سے فریاد کرنے لگا۔  
 سید ہجویریؒ، وہ آقا و مخدومِ اہم جس کی تربت پیرِ سنجر کے لئے بیت الحرم  
 کر کے طے جس نے ہستانون کا مشکل سلسلا ہند کی بنجر میں تخمِ سجدہ بویا  
 زندہ اس کی ذات سے پھر عہدِ فاروقی ہوا اس نے پھر دینا میں حق کا بول بالا کر دیا  
 وہ جہاں میں پاسبانِ عزتِ ام الکتاب اس کی حشمتِ حق مگر سے خانہِ باطل خراب  
 خاکِ پنجاب اس مسیحا دم سے زندہ ہو گئی نور سے اسکے ہماری صبح پیدا ہو گئی

عاشقِ کامل جہاں میں، قاصدِ طرادِ عشق  
 آشکار اس کی جبینِ پاک سے اسرارِ عشق  
 آؤ، میں اس کی سنا ہوں تمہیں اک استاں  
 اک کلی میں بند کرتا ہوں گلستاں کا بیاں  
 اک جوانِ خوب جو قامت میں مثلِ سرو تھا  
 چل کے شہرِ مرو سے لاہور میں وارد ہوا  
 اور ہوا حاضرِ حضورِ سید والا حنا ب  
 عرض کی حضرت سے محصورِ صفِ اعدا ہوں میں  
 تار کرے دور اس کی تاریکی کو نورِ آفتاب  
 ہر طرفِ پتھر کی بارشِ نیچ میں مینا ہوں میں  
 مجھ کو سکھلا دے خدا را اے شہِ گردوں مکاں  
 کس طرح پتے ہیں زندہ دشمنوں کے درمیاں  
 پیرِ روشن دل، کہ اسکی ذات میں شانِ جہاں  
 ایسی والستہ جلالِ شان سے تھی گویا جلال  
 یوں لگا کہنے کہ "اے نامحرمِ رازِ حیات  
 تیری نظروں میں نہیں انجام و آغاز حیات  
 بے خبر! تو نارِغِ اندیشہِ اغیار ہو  
 قوتِ خوابیدہ ہے تو بھی ذرا بیدار ہو  
 آپ پر جس دم گماںِ شیشہ کا پتھر نے کیا  
 شیشہ بن کر کیا لیا پھر ٹوٹ جانے کے سوا  
 راہِ رونے ناتواں اپنے کو جب باور کیا  
 اپنے تقدیرِ جاں کو رہن کے حوالے کر دیا  
 کب تلک کہتا ہے گا آپ کو تو آبِ دگل  
 بے خبر! ہے طور کے جلوں کا حامل تیرا دل



دوستوں سے کس لئے ہوتا ہے ایسا سرگراں  
 کس لئے ہوتا ہے ناداں شکوہ سنج دشمنان  
 تجھ سے سچ کہتا ہوں میں، دشمن بھی تیرا یا ہے  
 اس کی ہستی تیرے حق میں رونق بازار ہے  
 ہے جو اس دنیا میں دانا کے مقاماتِ خودی  
 جانتا ہے فضلِ ایزد، ہے اگر دشمن قوی  
 کشتِ انساں کے لئے دشمن ہے مانندِ سحاب  
 اس سے امکاناتِ انسانی میں ہر پالِ انقلاب  
 سنگِ رہ ہوتا ہے پانی، ہے اگر ہمتِ قوی  
 کوہِ صحرا میں سبھلا سیلابِ رکتا ہے کبھی  
 سنگِ رہ ہوتا ہے مردوں کو فسانِ تیغِ عزم  
 قطعِ منزل سے ہے مقصدِ امتحانِ تیغِ عزم  
 مثلِ حیواں کھانا پینا اور سونا بیچ ہے  
 گر خودی محکم نہیں تو تیرا ہونا، بیچ ہے  
 آپ کو اپنی خودی سے تو اگر محکم کرے  
 پھر اگر چاہے، جہاں کو درہم و برہم کرے  
 چاہتا ہے گرفتار تو آپ سے آزاد ہو  
 موت ہے اپنی خودی کو بھول جانا جانِ من  
 پہلے یوسفؑ کی طرح اپنی خودی میں کر مقام  
 پاس رکھ اپنی خودی کا اور مردِ کار ہو  
 مردِ حق بن جانِ من اور حاملِ اسرار ہو

شرحِ رازِ عشقِ قصوں میں سہا کر رہا ہوں  
پھول کو زونِ نفس سے گلستاں کرتا ہوں میں  
خوشتر آں باشد کہ سترِ دلبراں  
گفتہ آید در حدیثِ دیگر اں ۱۵  
(مولانا رومؒ)

## حکایت اُس پرندے کی جو پیاس کے مارے بیتاب تھا۔

اک پرندہ پیاس سے کچھ اس قدر بیتاب تھا  
باغ میں میرے کا اک ٹکڑا نظر آیا اسے  
کھا گیا کیسا فریبِ ربڑہ خورشید تاباں  
لیکن اُس میرے سے وہ پانی نہ حاصل کر سکا  
دل نہ تھا پہلو میں اس کے پارہ سیماب تھا  
پیاس کی شدت سے قطرہ آب کا سمجھا اُسے  
سنگِ پیرس مرغِ ناداں کو ہوا وسواسِ آب  
خوب ہی ٹھونگیں لگائیں اور تھک کر رہ گیا  
اس سے وہ الماس بولا اے گرفتارِ ہوس!  
بے خبر پانی کا میں قطرہ نہیں، ساقی نہیں  
تو مرے در پلے ہوا ہے کس قدر دیوانہ ہے!  
نہ ہر قاتل ہے یہ پانی آدمی کے واسطے  
لے کے کہ تو کرتا ہے مجھ پر تیز منقارِ ہوس!  
میں جہاں میں دوہڑوں کے واسطے باقی نہیں  
کیوں حیاتِ خود نما کے راز سے بیگانہ ہے؟  
دیکھتا نکڑے نہ اڑ جائیں تری منقار کے

۱۵ ترجمہ - ہے بہت اچھا محبت میں کہ رازِ دلبراں دوسروں کی بات کے پردے میں ہو جائے بیاں

اس کا مقصد جبکہ ہیرے سے نہ حاصل ہو سکا  
 جبکہ اراٹوں کا اس کے اس طرح خوں ہو گیا  
 اتنے میں آیا نظر شبنم کا قطرہ پھول پر  
 اس کی آبِ تاب تھی محو سپاس آفتاب  
 ایسا تارہ جسکی عادت رُم جو گردوں زادہ تھا  
 باغ میں آکر فریبِ غنچہ دکھا گیا  
 دیکھنے میں جیسے اشکِ عاشقِ دلِ زادہ ہو  
 وہ پرندہ اُڑ کے جبارِ شاخ کے نیچے گیا  
 اے، عدوے جاں بچنے کے لئے مضطر ہے تو  
 جب پرندہ پیاس کی شدت سے جاں برب ہو  
 قطرہ نرم اندام و نازک تھا تو آخر مر گیا  
 بے خبر حلقہ دی کے راز سے اک دم نہ ہو  
 وہ پرندہ اس سے ناامید ہو کر چل دیا  
 نغمہ لب پر بن کے فریاد و فغاں آنے لگا  
 تھا وہاں جوشِ اشکِ چشمِ بلبل جلوہ گر  
 اور اس کے حسم پر غالب ہر اس آفتاب  
 اور جودم بھر نمائش کے استادہ تھا  
 زندگی سے اپنی کچھ ہیرہ نہ حاصل کر سکا  
 جو سرِ مرزاں ٹپکنے کے لئے آمادہ ہو  
 قطرہ شبنم ٹپک کر اس کے منہ میں آگرا  
 پوچھتا ہوں تجھ سے ہیں، قطرہ ہے یا گوہر ہے تو؟  
 دوسرے کی زندگی کو اپنا سرمایہ کیا  
 ریزہ الماس تھا موجود لیکن وہ نہ تھا  
 ریزہ الماس ہوا اور قطرہ شبنم نہ ہو



پختہ فطرت اس جہاں میں صورت کہسار بن اور پھر تو حاصل صدا برگو ہر بار بن  
تو بھی اثباتِ خودی سے مردِ خوش انجام ہو لبتہ کرپائے کو اپنے اور سیم خام ہو

اک نیا نغمہ سنا، لے ہاتھ میں سائرِ خودی  
بر ملا کہدے بس اب دنیا سے تو رازِ خودی

## حکایت الماس و زغال

پھر میںِ خارِ حقیقت سے اٹھاتا ہوں نقاب  
ایک دن کہنے لگا میرے معدن میں زغال  
یار ہیں، ہمد ہیں یکساں، ہماری مہتِ بود  
میری قسمت میں مگر لکھا ہے کیوں مزا یہاں  
ایک، دنیا میں تیری اور میری اصل وجود  
اور تری قسمت میں ہو یا زینتِ تاج شہاں؟  
اور تیرے حسن سے آئینہ کا دل بھی ہے چاک  
میں تو وہ بد شکل، بہتر ہے کہیں مجھ سے خاک!  
پھر سناتا ہوں تجھے اک داستانِ لا جواب  
اے کہ تو سرمایہ دارِ جلوہ ہائے لازوال  
ایک، دنیا میں تیری اور میری اصل وجود  
اور تری قسمت میں ہو یا زینتِ تاج شہاں؟  
اور تیرے حسن سے آئینہ کا دل بھی ہے چاک  
اپنے جوہر کو جلا کر خاک کرنا میرا کام  
میری تاریکی سے روشن ہے بہت مجر کا نام

مجھ کو ٹھکرا دیتے ہیں سب پائے استحقار سے  
 اور جلاتے ہیں مرا جی سینکڑوں آزار سے  
 اس سرو ساماں پہ مجھ کو کیوں نہ رونا چاہئے؟  
 کیا کسی کا یہ سرو ساماں بھی ہونا چاہئے؟  
 انجماد و دود پر ہے زندگی کا انحصار  
 اک شرارِ حسبتہ کالے دے کے میں سرمایہ دار  
 تیری صورت اور سیرت دونوں ہیں انجم مثال  
 نوبہ نوبہ جلوس کا مالک سے ترا حسن و جمال  
 گاہ روشن تجھ سے آنکھیں قیصر و فقہور کی  
 گاہ زیبائش ہے تجھ سے دستہ سا طور کی  
 یہ کہا سیرے نے اس کے رفیق نکتہ ہیں!  
 خاک تیرہ پختہ ہو کر بنتی ہے روشن نیگیں  
 اپنے گرد و پیش سے ہوتی ہے جب مصر و جنگ  
 پختگی سے میرا سپیکر بھی سراپا نور ہے  
 یختہ ہوتی ہے وہ اس پیکار سے مانندِ سنگ  
 خوار ہے دنیا میں تو اپنے وجودِ خام سے  
 میرا سینہ سینکڑوں جلووں سے رشک طور ہے  
 کون کہتا ہے گرفتِ غم و دوسواں ہو  
 اور پڑا جلتا ہے اپنی نرمی اندام سے  
 ہوتے ہیں اسکی دنیا سے دونوں عالم مستیز  
 پختہ مثل سنگ ہو کر تو بھی اک الماس ہو  
 سنگ اسود کیا نہیں اک مشت خاک لہجے خبر!  
 جو کہ ہوتا ہے جہاں میں سوت کوش و سخت گیر  
 وہ نکالا ہے گریبانِ حرم سے جس نے سر



رتبہ اس کا طورِ سینا سے مگر بالا ہوا اس جہاں میں بوسہ گاہِ اسود و احمر بنا

الغرض ہے پختگی میں آبروئے زندگی

نا توانی، ناکسی کی اصل ہے ناپختگی

## شیخ و برہمن کی حکایت اور گنگا اور ہمالیہ کا مکالمہ

اس باب میں کہ حیاتِ مٹی کا تسلسل قوم کی روایاتِ مخصوصہ کے مضبوطی کے ساتھ قائم رکھنے پر موقوف ہے۔

اک برہمن تھا بنارس میں نہایت محترم	جو ہمیشہ رہتا تھا غرقِ یم بود و عدم
علم اور حکمت کا بھی رکھتا تھا سرمایہ بڑا	عارفانِ حق کا بھی دل سسارادت مند تھا
ذہن تھا اس کا رسا اور فکر جدتِ آفریں	عقل تھی چالاک اور ادراک تھا کیوں نشیں
تھا مکاں اس محترم کا صورتِ عنقا بلند	مہرومہ تھے شعلہٴ افکار پر اسکے سپند
ایک مدت کچھ نہ پایا خونِ ارہاں کے سوا	معرفت کے جام سے بے بہرہ ساقی نے لکھا

بوستانِ علم و حکمت میں بچھا رکھا تھا جال  
 ناخنِ تدبیر خون آلود ہو کر رہ گیا  
 ایک دن آخر گیا اک عاربِ کامل کے پاس  
 اور اس کی گفتگو کو غور سے سننے لگا  
 شیخ یوں کہنے لگا اس طائفِ فلاک سے  
 جب سے تو آوارہ کوہِ ویسا ہاں ہو گیا  
 خاک کے ذروں سے ہو کر بے نیاز اے بیخبر!  
 میں نہیں کہتا بتوں سے دور ہو، بیزار ہو  
 اے امانت دارِ تہذیب کہن! سن تو ذرا!  
 جب کہ ہے والستہ جمعیت سے ملت کی حیات  
 جب کہ رسمِ کافری ہی میں ابھی کامل نہیں  
 دور ہم تم جا پڑے ہیں جادہ تسلیم سے  
 طائرِ معنی کا تھا اس جال میں آنا محال  
 عقدہ بود و عدم فیکن نہ اس سے کھل سکا  
 مردِ صاحبِ حال یعنی شیخِ اہل دل کے پاس  
 چپ رہا ایسا کہ گویا بہت بنا بیٹھا رہا  
 باندھ لے ناداں ذرا چھڑنا اس خاک سے  
 تیری پروازِ تخیل کی نہیں کچھ انتہا  
 فکر بے حاصل برائے گوہرِ انجم نہ کر!  
 توجہ کافر ہے تو پہلے لائقِ زنا رہو  
 یوں نہ ٹھکرا مسلکِ آبا کو تو بہرِ خدا!  
 کفر بھی سرمایہ جمعیت کا ہے اے نیک ذات!  
 تو یقیناً درخورِ طوفِ حریمِ دل نہیں  
 دور ہے آذر سے تو، میں دور ابرہہ سے

قیس ہی اپنا ابھی سودائی محمل نہیں      قیس ہو کر بھی جنونِ عشق میں کامل نہیں!

تو نے حبِ اپنی خودی کی شمع کو گُل کر دیا

آسماں پہیا تختِ تیل ہو گیا، تو کیا ہوا!

تھام کر کہسار کے دامن کو دستِ موج سے      یوں ہمالہ سے کہا اک روز رو دگنگ نے

”اے کہ ہے صبحِ ازل سے تو برابرِ یخِ بدوٹل      اور دیاؤں سے ہے تیرا بدن زنا پر پوش

حق نے گو تجھ کو کیا ہے محرمِ چرخِ بریں      پر تجھے حاصلِ خرامِ ناز کی لذت نہیں

طاقتِ رفتار سے محروم تجھ کو کر دیا      اس وقارِ رفعت و تمکین میں آخر کیا ملا؟

زندگانی ہے جہاں میں حرکتِ پیہم کا نام      جس طرح ہے موج کی ہستی فقط اک رم کا نام“

کوہ نے دریا سے حبِ یہ طعنہ بیجا سنا      مثلِ بحرِ آتشیں پر غیظ ہو کر یوں کہا

”اے کہ خود کو دیکھتا ہوں میں تم سے آئینے میں      تیرے جیسے سینکڑوں ریا میں میرے سینے میں

یہ خرامِ ناز ہے نادانِ اسامانِ فنا      کھو دیا جس نے خودی کو ہے وہ شایانِ فنا

تو کہ ہے راہِ خودی سے مطلقاً نا آشنا      اس لئے نقصان کو سمجھا ہے تو نے فائدہ



مذہبِ ہندو میں تو لاریب گردوں زادہ ہے  
 تو نے قلم کے حوالے اپنی ہستی کو کیا  
 پر یقیناً تجھ سے بہتر ساحلِ افتادہ ہے  
 مثلِ گل خود دار رکھ گلشن میں اپنے آپ کو  
 آہ ناداں! نقدِ جاں کو نذرِ رہزن کر دیا!  
 زندگی دراصل اپنے آپ بڑھنے کا ہے نام  
 نشر و بکے واسطے منت کش گالچیں نہ ہو  
 اور خیابانِ خودی سے پھول چننا اس کا کام  
 قرن گزے اس طرح مجھ کو کھڑے اے پر غرور  
 تو گماں کرتا ہے ہوں میں کس قدر منزلِ سکور  
 میری ہستی بڑھتے بڑھتے ہو گئی گردوں مقام  
 گرد میری رفعتوں سے شریا جس کا نام  
 اپنی ہستی کو کیا گلشن میں تو نے بے نشان  
 اور ہے مسجودِ انجم میری چوٹی بے گماں  
 دیکھتی ہیں میری آنکھیں صاف اسرارِ فلک  
 کان سنتے ہیں مرے آواز پر ہاتے ملک  
 جبے سوزِ سعی پیہم نے جلایا ہے مجھے  
 آپڑے لعلِ دگر کے ڈھیر میرے سامنے  
 در درونِ سنگ و اندر سنگ نار  
 آب را بر نار من بنو و گزرا<sup>۱</sup> (مولانا روم)  
 بڑھ کے قلم سے بند آ رہو، طوفان سے نہ ڈر  
 ایک قطرہ ہی سہی تو آپ کو صنائع نہ کر  
 اور کسی شاہد کے کالوں کے لئے آویزہ ہو  
 آب گوہر کر کے حاصل تو بھی گوہرِ ریزہ ہو

۱۔ ترجمہ۔ پتھروں میں میرے پتھراں آگ کو دیکھا نہیں؟ آگ تک میری گور پانی کا ہو سکتا نہیں۔



یا بلند اپنی خودی کو کر، سبک فدا ہو  
ابرہہ برق انداز ہو یا ابرہہ دریا بار ہو  
تا سمندر تیرے آگے گدیہ طوفان کرے  
بلکہ تجھ سے شکوہ ہائے تنگی داماں کرے  
اور کمتر آپ کو سمجھے وہ موج آب سے

خاکساری سے نئے قدموں میں آکر گر پڑے

اس بیان میں کہ مسلمان کی زندگی کا مقصد اعلیٰ کلمۃ اللہ ہے  
اور جہاد، اگر اس کا محرک جوع الارض ہے تو مذہب اسلام میں حرام ہے۔  
اے مسلمان! صبغۃ اللہ خودی کو رنگ دے  
عشق کو سراپا یہ ناموس و نام و تنگ دے  
عشق ہے مسلم کی فطرت میں تو اک قاہر ہے وہ  
مسلم اور عاشق نہ ہو، مسلم نہیں کا فر ہے وہ  
کام ہے مسلم کا ہر دم تابن حکم خدا  
اُس کھانا، اُس کا پینا اُس کا سونا، جاگنا  
مرضی حق، مرضی مومن میں ہو جاتی ہے گم  
بات کو میری مگر باور بھی کر سکتے ہو تم؟  
خیمہ زن میدانِ الا اللہ میں، اسکی ذات  
شاہد حق نوع انسان میں، وہ والا صفات  
نور حق سے کر منور ظلمتِ اعمال کو  
چھوڑ قبل و قال تا حاصل مقام حال ہو

بادشاہی میں تیجھے درویش رہنا چاہئے  
 اپنے کاروبار کی غایت بنا قرب خدا  
 اور جو حق تلوار سے اس کی نہیں ہوتا بلند  
 کیا سنا تو نے کبھی نام میاں میرِ ولی؟  
 اتباعِ مصطفیٰ میں جس کا ہر انداز تھا  
 اس کی تربت آج بھی اس شہر کا ایمان ہے  
 جیہ فرسا آستان پر جس کے ساتوں آسمان  
 تھا مگر وہ بادشہ اک بندہ حرص و ہوا  
 لحظہ لحظہ مانگتی تھی طمع اک شہرِ جدید  
 وہ زمانہ ہے کہ ہنگامے دکن میں ہیں بپا  
 شیخ کی خدمت میں آیا وہ شہرِ ہندستان  
 بھاگ آتا ہے مسلمان سوئے حق انجام کار  
 یعنی حق ہیں اور حق اندیش رہنا چاہئے  
 جنگ بالکل خیر اگر منظور ہے اس کی رضا  
 جنگ کرنا قوم کے حق میں نہیں ہے سو مند  
 ہر خفی تھا جس کے نور جاں سے دنیا میں جلی  
 نغمہ عشق و محبت کے لئے اک ساز تھا  
 مشعلِ نور ہدایت ہے ہمارے واسطے  
 تھا مرید کتریں اس کا شہرِ ہندستان  
 قصدِ تسخیر ممالک دل میں رکھتا تھا سدا  
 اور لبِ شمشیر پر تھا نغمہ ہل من مزید  
 اور اک لشکرِ شریک جنگ سے اس شاہ کا  
 تاکہ ہو اس کی دعا سے کامیاب کامراں  
 اپنی تدبیروں کو کرتا ہے دعا سے استنوار

شیخ سن کر گفت گوے شاہ کو خاموش تھا  
 اور بزم شیخ میں ہر اک سر اپا گھوش تھا  
 آن پہنچا اتنے ہی میں اک مرید با صفا  
 نذر اک چاندی کا سکہ شیخ کو کرنے لگا  
 عرض کی منظور کراے پیر! یہ نذر حقیر  
 اے کہ تو بھٹکے ہوؤں کا ہے جہاں میں دستگیر  
 ہو گیا ہے تن بدن محنت سے میرا چور چور  
 تب ہوا ہے یہ درم مجھ کو میسر اے حضور!  
 شیخ نے فرمایا، یہ حق ہے ہمارے شاہ کا  
 جو کہ ہے پیراں شاہی میں پوشیدہ گدا  
 گرچہ ہے وہ حکمرانِ انجم و خورشید و ماد  
 ہے مگر نادار بھی سب سے سوا یہ بادشاہ  
 دوسروں کے حوان پر رکھتا ہے یہ اپنی نظر  
 اس کی جوع الارض سے ہے اک جہاں زیر و زبر  
 قحط اور طاعون اس کی تیغ کی برکات سے  
 اک جہاں ویرانہ اس کے شوق تعمیرات سے  
 حلق ہے فریادیں کس درجہ اس نادار سے!  
 اس تہید سستی کے مائے اس ضعیف آزار سے!  
 سطوت و شوکت ہے اس کی دشمن اہل جہاں  
 یہ ستم گر راہ زن، اور نوعِ انساں کا رواں  
 ہو کے بدست خیال خود فریب و فکر خام  
 رکھتا ہے نادان یہ تاراج کا تسخیر نام  
 اک طرف ہے فوج شاہی اک طرف فوجِ غنیم  
 اس کی جوعِ ارض سے دونوں دل یکساں درویم



بھوک جوتی ہے گدا کی آتش جان گدا بھوک سے سلطان کی ملک قوم کے حق میں قضا

غیر حق کے واسطے خنجر ہو جس کا بے نیام

ہے یقین اول اسی کا کام ہو جائے تمام

میر نجات نقش بند کی نصیحت جو بابائے صحرائی کے نام سے مشہور

ہیں اور نصیحت مسلمانان ہند کے لئے تحریر فرمائی ہے ۔

اے کہ مثل گل اگا ہے خاک سے کچھ غور کر ! تیری پیدائش بھی ہے بطنِ خودی سے بیخبر !

تو خودی سے چھوڑتا تیرا بقا انجام ہو قطرہ بن کر رہ مگر ایسا کہ بحرِ آ شام ہو

اے کہ انوارِ خودی سے مثلِ جام جم ہے تو ! گر خودی کو تو نے محکم کر لیا محکم ہے تو

فائدہ تیرا ہے جس میں، بس یہی سودا ہے وہ جس کو یہ دولت ملے، مردار بن جاتا ہے وہ

ہمت ہو کر نیستی سے تو ہر ساں ہو گیا اے ترے قربان کیوں اس درجہ ناداں ہو گیا !

سن رہا ہوں متصل آوازِ سازِ زندگی اس لئے تجھ سے بیان کرتا ہوں ازِ زندگی

ڈوب جاگو ہر صفت اپنی خودی میں بے عمل ! شوق سے پھر اپنی خاوت گاہ سے باہر نکل



اپنی خاکستر سے لے ناواں شرار اندوز ہو  
 شعلہ بن کر اپنی گرمی سے نظر افروز ہو  
 چھوڑ دے یہ محنت چل سالہ لے مرد گزافا  
 شعلہ جوالہ کے مانند کر اپنا طواف  
 زندگانی ہے طوافِ غیر سے چھٹنے کا نام  
 جان لینا یعنی اپنے آپ کو بیت الحرام  
 بازو سے ہمت سے اڑا، اس خاک کے آزاد ہو  
 مثل طائر بے نیازِ خطرہ افتاد ہو  
 اور اگر طائر نہیں ہے تو، تو پھر بہرِ خدا  
 اے کہ تو رکھتا ہے اپنے سر میں سوداِ علوم  
 علم را بر تن زنی مارے بود  
 کیا کبھی تو نے سنا ہے قصہ مولا سے ردّم؟  
 پاؤں میں جس کے پڑی زنجیر تو جہاں سے عقل  
 دہ، کہ تھا جس کا حلب میں مکتبِ مدرسِ علوم  
 ایسا موسیٰ جس نے دیکھا ہی نہیں سینا سے عشق  
 جس کی کشتی ہو گئی طوفانی ظلماتِ عقل  
 جو نہیں واقف کہ ہے کیا لذتِ سودا سے عشق  
 علم و حکمت کے پڑتا تھا جو موتی بے ہوا  
 جو تشنگ کا بیاں کرتا تھا یا اس شارق کا  
 ہر خفی کو جس کے نورِ فکر نے ظاہر کیا  
 وہ کہ حکمت اسکی مشائیں کی عقدہ کشا

لے ترجمہ - علم اگر ہے تن کی خاطر تیرے حق میں مابے دل کی خاطر ہے تو وہ تیرا رفیق و یار ہے

سامنے اس کے رہا کرتا تھا انبارِ کتب  
 پیر تبریزِ از رہِ تعمیل ارشاد کمال  
 اور کہا رومی سے یہ عوفاے قیل و قال کیا؟  
 مولوی صاحب نے فرمایا بس اے نادان بول  
 میرے مکتب سے نکل جا بس اسی میں خیر ہے  
 یہ ہمارا قال تیری فہم سے ہے ماورے  
 شمس تبریزی نے جس دم یہ سنا طیش آگیا  
 اور زمیں پر جا پڑی جس وقت وہ برقِ نظر  
 آتشِ دل نے جلایا خرمنِ ادراک کو  
 مولوی جو تھا ابھی بگائے اعجازِ عشق  
 بولا گھبرا کر کہ یہ کیا تو نے اے نادان کیا؟  
 شیخ نے اس سے کہا اے کافرِ مسلم نما!  
 اپنے مکتب میں بیاں کرتا تھا اسرارِ کتب  
 ڈھونڈتا اک روز آیا مکتبِ ملا جلال  
 یہ قیاسِ دوسم یہ برہان و استدلال کیا؟  
 کیا مقالاتِ خرد کو تو نے سمجھا ہے کھٹھول؟  
 تو ہے نادانِ اہل اور حکمت میں باہم پیر ہے  
 شیشہِ ادراک کو دیتا ہے یہ نور و صفا  
 اور پیدا دل سے اس کے شعلہٴ آتش ہوا  
 اس کے سوزِ دم سے اٹھے خاک سے اک دم شرر  
 اور خاکستر کیا اس دفترِ ناپاک کو  
 مطلقاً نا آشناے نغمائے سازِ عشق  
 دفترِ اربابِ حکمت نذرِ آتش کر دیا!  
 یہ ہے ذوق و حال، تو اس کو سمجھ سکتا ہے کیا!

یہ ہمارا حال تیری فکر سے ہے مادی غور سے دیکھے تو شعلے ہیں ہمارے کیہیا  
 تو نے اپنا ساز و سامان ہر فنِ حکمت کو کیا بے تگرگ افشاں ہمیشہ ابر تیری فکر کا  
 آگ روشن کر کوئی اپنے خس و خاشاک سے اور کر شعلہ کوئی تعمیر اپنی خاک سے  
 علمِ مسلم غیر سوزِ دل نہیں ہوتا تمام اور اسلام اصل میں بس ترکِ آفل کا ہے نام

قیدِ آفل سے جو ابراہیم نے پائی نجات  
 بن گئی آگ اس کے حق میں گلشنِ مینو صفا

علمِ حق کی تجھ کو اے نادان کچھ پروا نہیں ایک دنی کے لئے ہمارا ہے تو نے نفتِ بدیں  
 جستجوئے سرمہ رکھتی ہے تجھے زارِ دھریں اور اپنی سرنگیں آنکھوں سے تو واقف نہیں  
 شوق سے تو مانگ لے خنجر سے بھی آبِ بقا اور دہانِ اثر دہا سے آب کو شرکا مرا  
 سنگِ سود مانگ جا کر بے دھڑک بتخانے سے مشکِ ناز کی تمنا کر سگِ دیوانہ سے  
 پر نہ لینا دانشِ حاضر کے آگے دل کا نام معرفت کے کیف سے خالی ہے اس کا فر کا جام  
 مدتوں مجھ کو تگ و دو میں رکھا ہے بیقرار تب کہیں تہذیبِ حاضر کا ہوا ہوں راز دار



باغبانوں نے کیا ہے خوب میرا امتحاں      تب کیا ہے مجھ کو آخر رازِ دانِ گلستاں  
 لالہ زارِ درسِ عبرت ہے یہ گلزارِ خوشاب      کاغذی پھولوں کے مانند ایک ہمت کا سراب  
 گر گیا جس وقت نظروں سے گری یہ گلستاں      شاخِ طوبیٰ پر بنایا میں نے اپنا آسٹیاں  
 علمِ حاضر ہے اے ناداں! بڑا بھاری حجاب      بت پرستی، بتِ فروشی، بتگری میں لا جواب  
 اس کو زندانِ مظاہر کی ہوا اس آگئی      اس حدِ درس سے یہ باہر نہیں نکلا کبھی  
 راستے میں زندگی کے تھک کے آخر رہ گیا      اپنے ہاتھوں سے گلے پر اپنے خنجر رکھ دیا  
 آگ رکھتا ہے، مگر مانند لالہ سرود ہے      شعلہ رکھتا ہے، مگر مانند لالہ سرود ہے  
 اس کی نظرت رہ گئی محروم سوزِ عشق سے      اس جہاں جستجو میں اس لئے ناشاد ہے  
 عشق ہے بے شبہ افلاطونِ علیہا عِقل      عشق کے نشتر سے پُرخوں ہے، دل سودا عِقل  
 عالمِ کون و مکانِ ساحد ہے یہ مسجود ہے      یہ جہاں میں سومناتِ عِقل کا محمود ہے

یہ مے دیرینہ لیکن اس کی بینا میں نہیں  
 شورشِ یارب سے خالی اسکی راتیں گئیں



مرتبہ شمشاد کا اپنے نہ سمجھا ارجہ بند  
 مثل نے اپنی خودی سے آپ کو خالی کیا  
 اے گدا کیوں ریزہ چین کے دروں کے خوان؟  
 بزمِ مسلم اور چراغِ غیر کیا اندھیر ہے!  
 اس لئے تو غیر کی آواز پر مرنے لگا  
 زم کیا جس وقت آہو نے سوا رکعبہ سے  
 جس اپنی مانگتا ہے غیر کی دکان سے!  
 بو نہیں تو گل بھی اجزائے پریشاں ہو گیا  
 آہ مسجد اور شرارِ دہر کیا اندھیر ہے!  
 بھاگنے والے خودی سے پھر خودی میں لوٹ آ  
 چیر ڈالا اس کا پہلونا دکِ سیارہ نے  
 پھر خدا را ڈھونڈ اپنی وحدتِ کم کردہ کو  
 ہو گئے کافر کہ چھوڑا ہم نے ملت کا شعار  
 کیا ہوئے وہ جام و مینا ساتی دیرینہ کے  
 اور خدا جانے وہ زندانِ حجازی کیا ہوئے  
 اب ہمارے ہی بتوں سے یہ حرم آباد ہے  
 خندہ زن ہے کفر بھی اسلام پر فریاد ہے!  
 شیخ نے ہاراتوں کے عشق میں اسلام آہ!  
 ہاتھ میں تسبیح اور زناریِ اصنام آہ!  
 یوں گلی کو چوں میں ہیں وہ سحرِ ہرناویر  
 موسفیدی کی کرامت ہی بن بیٹھے ہیں پیر

دل کہ نقش لا الہ سے یک تلم بیگانہ ہے      یہ ہوس کے نو بنوا صنم کا بت خانہ ہے  
 جس کے لمبے بال ہیں بسجے وہی اب خرقہ پوش      کس قیامت کی ہیں سوداگران دیں فروش  
 کرتے پھرتے ہیں مریدوں کو لئے ہر دم سفر      اور ضروریات ملت سے ہیں یکسر بے خبر  
 مثلِ نرگس ان کی آنکھیں نور سے محروم ہیں      اور سینے دل سے، اور دل شور سے محروم ہیں  
 واعظ نادان کو بتخانے کا سودا ہو گیا      مفتی ملت نے سکے حق میں فتویٰ دیدیا

اب بتاؤ اے ہمارے دوستو! ہم کیا کریں  
 حیب ہمارے پیروی رُخ سوتے میخانہ کریں

## الْوَقْتُ سَيْفٌ

عنبر آگیں ہو الہی خاکِ پاکِ شافعیؒ      اک جہاں ہے سرخوش صہبائے پاکِ شافعیؒ  
 عرش سے لایا ہے تارے توڑ کر فکرِ رسا      وقت کو تعبیر جس نے تیغ بُراں سے کیا  
 مجھ سے کیا تعریف ہو سکتی ہے اس تلوار کی      اس کی آبِ و تاب ہے سرمایہ دار زندگی

اس کے مالک کو نہیں اندیشہ بیم ورجا  
 ننگ خسار سے وہاں شیعے ہوں اس کی نرسے  
 حضرت موسیٰؑ کے قبضے میں یہی شمشیر تھی  
 چاک اس نے سینہ دریا سے احر کر دیا  
 پنجہ حیدر کہ جو مشہور خیر گیر تھا  
 گردش گردن گرداں دیدنی ہے اے عزیز  
 کیوں اسیر دوش و ذوا ہو گیا انسان دیکھ  
 اپنے آب و گل میں تو نے تخم ظلمت بو دیا  
 لے کے اپنے ہاتھ میں پیمانہ لیسل دہار  
 رشتہ اوقات کو تو نے کہا زنا و دوش  
 کیمیا تھا تو مگر اک تودہ گل ہو گیا  
 تو مسلمان ہے تو بس اب توڑ اس زنا کو  
 ہاتھ اس کا ہے بد بیضا سے بھی روشن سوا  
 رہ اگر چاہے تو دریا ایک دم سحر اپنے  
 معنی تقدیر خالق جن کی ہر تدبیر تھی  
 اک سمندر خشک مثل خاک ہو کر رہ گیا  
 جانتے ہیں سب کہ مالک تھا اسی شمشیر کا  
 انقلاب روز و شب تیرے سمجھنے کی ہے چیز  
 تیرے دل میں بھی نہ الا اک جہاں پہناں دیکھ  
 آہ ظالم وقت پر تو نے گماں خط کا کیا  
 فکر تیرا نا پتا رہتا ہے طول روزگار  
 عشق میں ضام باطل کے گنوائے اپنے ہوش  
 ستر حق پیدا ہوا سفاہ عرف باطل ہو گیا  
 اور بیضائے شمع بزم ملت احسرا ہو



نو کہ سمجھا ہی نہیں نادان معنی وقت نے  
 کیسے واقف ہو جیاتِ جادواں گرا نہ سے؟  
 روز و شب کی قید میں سمجھے گا کیا انداز وقت  
 نلی مع اللہ سے سمجھ کر ہے سمجھنا رازِ وقت  
 ایں واں پیدا ہوئے ہیں وقت کی رفا سے  
 زندگی خود راز ہے اک وقت کے اسرار سے  
 اور اصلِ وقت یہ خورشید ہو سکتا نہیں  
 وقت ہے جاوید یہ جاوید ہو سکتا نہیں  
 عیش اور غم، عید اور عاشورہ کیا ہے؟ وقت ہے،  
 اور یہ تاب مہ و خورشید کیا ہے؟ وقت ہے  
 وقت کو مثلِ مکاں تو لے جو سمجھا حیف ہے!  
 اور پھر یہ امتیازِ دوش و فردا حیف ہے!  
 ایک مثلِ بو، کیا رم تو لے اپنے باغ سے  
 آپ ہی زنداں بنایا آہ! اپنے واسطے  
 وقت اپنا ہے نہ جس کی ابتدا و انتہا  
 جو ہمارے ہی ضمیروں کے جیباں سے اُگا  
 زندہ ہو جاتا ہے اس کی معرفتِ زندگی  
 کیسا زندہ؟ جس کی ہستی صبح سے تابندہ تر

زندگی ہے یہ زمانہ اور زمانہ زندگی

اس پہ شاید لا سُبُو الدَّهْرِ فَرَمَانِ نَبِیْ

تجھ سے کرتا ہوں بیاں اک نکتہ روشنِ مثلِ  
تا تجھے معلوم ہو جائے تیرے بعد و حر



عبد کو کر لیتے ہیں گم آپ میں میل و نہار  
 اور حُر کے دل میں ہو جاتا ہے گم یہ روزِ گار  
 مشغلہ ہے عبد کا، بنت کفنِ ایام کا!  
 اور روز و شب کی چادر اپنے اوپر تاتا  
 اور حُر اس آبِ و گل کے دام میں پھنستا نہیں  
 بلکہ چھپا جاتا ہے وہ کون و مکاں پر بالیقین  
 عبد طائر کی طرح مجبوس دامِ صبح و شام  
 لذتِ پرواز اس کی جان پر یکسر حرام  
 اور دیکھو! سینہ آزادہ چاہکِ نفس  
 طائرِ ایام جس میں بند ہے، الیہا نفس  
 عبد کی فطرت کا حاصل دیکھئے تو کچھ نہیں  
 وارداتِ نو بنو سے بے خبر زار و حزیں  
 ایک ہے اس کا گراں باری سے ہر لحظہ مقام  
 کام ہے حُر کا مگر تو آفرینی دم بدم!  
 اس کی فطرت بے نیاز زحمت تکرار ہے  
 عبد کے حق میں زمانہ پاؤں کی زنجیر ہے  
 مردِ حُر کی سمیتِ عالی قضا کی راز دار  
 ماضی و آئندہ اس کے حال میں معبود ہیں  
 اس کے ایما سے ہیں گویا حادثاتِ روزگار  
 دیر کتنے ہوں مگر اس کے لئے سب زود ہیں  
 اور زباں پر اس کی ہر دم شکوہ تقدیر ہے

یہ سخن میرا مگر صوت و صدا سے پاک ہے      بے خبر اس جاخرد عاجز یہاں ادراک ہے  
حرف کا رونما کہ ہے معنی کے آگے شرمسار      شکوہ معنی کہ ہے کب حزن اس کو سازگار  
معنی زندہ حب آیا حزن میں مردہ ہوا      شعلہ اس کا سالن کی ٹھنڈک سے افسردہ ہوا  
تیرا دل ہے رازدارِ نکتہ غیب و حضور      تیرا دل گنجینہ اسرارِ ایام و مرور

نغمہ خاموش رکھتا ہے جہاں میں سازِ وقت

غوطہ زن ہودل میں مل جائے گا تجھ کو رازِ وقت

یاد ہیں ہم کو ابھی وہ دن کہ تیغ روزگار      تھی ہماری قوتِ بازو کی یار سازگار  
ہم نے بویا تھا دلوں کی سہریں میں تخم دیں      چہرہ حق سے اٹھایا پردہ ہم نے بالیقین  
عقدہ عالم کیا حل ناخن تدبیر سے      کھول دی قسمت جہاں کی نغمہ تبکیر سے  
بادہ گلگوں خم حق سے پیاجی کھول کر      اور پُرانے میکدوں کو کر دیا زبرد زبر  
ایکڑا اب مہیا ہے دیرینہ تری بینا میں ہے      شیشہ بھی پانی ہو وہ گرمی تری مہیا میں ہے  
کس لئے اس درجہ تجھ کو سخت دیندار ہے      کس لئے ہے طعنہ زن مسلم اگر نادار ہے

زیبِ محفل تھا ہمارا جام بھی اے بے خبر! ہم بھی رکھتے تھے کبھی پہلو میں دل تو یاد کر!  
 عصرِ نو جو سینکڑوں جلوؤں کے آراستہ یہ ہمارے ہی غبارِ راہ سے پیدا ہوا  
 کشتِ زارِ حق کو سینچا ہم نے اپنے خون سے ہے جہاں ممنون ہماری حق نمائی کے لئے  
 ہم نے ہی یوں صاحبِ بکیرِ عالم کو کیا خاک سے اپنی رکھی ہم نے ہی کعبوں کی پنا  
 حرفِ اقراءِ حق تعالیٰ نے سکھایا تھا ہمیں اور اپنے رزق کا قاسم بنایا تھا ہمیں  
 چھن گیا ہاتھوں سے اپنے آج گوتاجِ ذنگیں یہ گدرا تیری حقارت کے مگر شایاں نہیں  
 تیری نظروں میں زیاں اندیش ہیں بیکار ہیں بے سرو ساماں قدامتِ آشنا و خوار ہیں  
 ہم کو حاصل ہے مگر وہ اعتبارِ لا الہ کائناتِ ہر دو عالم رکھتے ہیں زیرِ نگاہ  
 واسطہ اب کیا عزمِ امر و نافر داسے رہا؟ ہم نے باندھا ہے کسی کے ساتھ پیمانِ ونا  
 سینہٴ عالم میں ہیں ہم سرِ مکنونِ خدا وارثِ موسیٰ و ہارون ہم کو خالق نے کیا  
 چاند اور سورج میں ہے اب بھی ہماری فبتاب اب بھی رکھتا ہے ہزاروں بجلیاں اپنا سحاب

ذات ہے اپنی جہاں میں ذاتِ حق کا آئینہ  
 مستیِ مسلم ہے اک آیاتِ حق کا آئینہ



# دُعَا

اے دل و جانِ وجودِ عالمِ امکان ہے تو ہم سے کیوں بیزار ہے آخر ہماری جان سے تو  
 نغمہ پرورِ فیض سے تیرے ریا پر زندگی موت تیرے راستے میں کامیابِ زندگی  
 پھر خدا را آ کے تسکینِ دلِ ناشاد کر یعنی پھر سنیوں کو اپنے عشق سے آباد کر  
 چھین لے پھر ہم سے اس سودا گنگ نام کو پختگی کر دے عطا پھر عاشقانِ خام کو  
 شکوہ ہم رکھتے ہیں اپنے بختِ نافرہام سے ہے کند اپنی بہت کوتاہ تیری بام سے  
 کیوں چھپاتا ہے ہتی دستوں سے تو اپنا جمال کر عنایت ہم کو ارزاں عشقِ سلمان و بلالؑ  
 چشمِ بخواب و دلِ بیتاب ہم کو بخش دے پھر ہماری فطرتِ سیما ہم کو بخش دے  
 ہم کو دکھلا دے الہی! پھر وہ آیاتِ مبیں سامنے ہو منظرِ اَعْنَاقِ اَعْدَا خاضعینؑ  
 کوہِ آتشِ خیز کر دے پھر ہماری کاہ کو پھر جلادیں ہم اسی آتش میں غیر اللہ کو  
 چھوڑ دیں وحدت کی راہیں جب ہی قوم نے رشتہ مقصود میں عقدِ ہزاروں پڑ گئے  
 اب ستاروں کی طرح ہم ہیں پریشاں سرسبز اصل میں سب ایک اور بیگانہ ہیں باہمدگر



بھرانِ اوراقِ پریشاں کا وہی شیرازہ ہوا | پھر وہی دنیا میں آئینِ محبت تازہ ہوا  
ہم سے جو خدمت کبھی لی تھی خدارا پھر بھی لے | یعنی اپنا کام اپنے عاشقوں کو سونپ دے  
راہرو میں ان کو پہونچا منزلِ تسلیم پر | پھر عطا ان کو وہی ایمانِ ابراہیم کر  
اور لا کے شغل سے آگاہ کر دے عشق کو

آشنائے رمزالا اللہ کر دے عشق کو

میں کہ اوردوں کے لئے جلتا ہوں یارب شمع سا | اور سکھاتا ہوں طریقِ گریہ و آہ و فغاں  
مجھ کو وہ آنسو عطا کر دے جو دلِ فروز ہوں | بے قرار بے سکوں بیتابِ راحت سوز ہوں  
باغِ نین بودوں میں انکو اور پیدا آگ ہو | آگ دھو ڈالے قبائِلِ لالہ سے جو داغ کو  
دوش کی جانب سے دل، آنکھیں سُوکھو فردا لگیں | اس طرح ہوں درمیانِ انجمنِ تنہا نشیں  
”ہر کسے از ظنِ خود شد یارِ من“ | از درونِ من نجست اسرارِ من  
آہِ دُنیا میں نہیں ملتا کوئی اپنا ندیم | نخلِ سینا ہوں مگر پیدا نہیں میرا کلیم  
کیسا ظالم ہوں کہ میں خود پر جفا کرتا رہا ! | آگ کے شعلے کو اپنی گود میں پالا کیا !

حیف! لیکن کوئی میرے راز کا جو یا نہیں

ما ترجمہ۔ جس کو دیکھو ہے گماں سے اپنے، میرا ہم نشیں

آگ بھی کیسی جو ہے غارت گر سامانِ ہوش  
 آج بے شعلہ اسی کا اور مراد امانِ ہوش  
 عقل کو جس نے جنوں کا راستہ بتلادیا  
 علم کا جس نے متاعِ زندگی غارت کیا  
 ہو گیا خورِ شدید جس کسوز سے گرد و مقام  
 بجلیوں کا طوف میں جس کے ہمیشہ اثر دام  
 پہلے شیم کی طرح میں دیدہ گریاں ہوا  
 بعد مدت پھر امینِ آتش پہنا ہوا  
 میں نے شمعِ بزم کو سوزِ عیاں سکھلادیا  
 خود مگر دنیا کی نظروں سے ہٹاں جلتا رہا  
 ہو گیا آخر مرا ہر موئے تن آتش فشاں  
 اور رگِ اندیشہ سے ہونے لگے شعلے عیاں  
 میرا بلیلِ دانہ چینِ خرمِ آتش ہوا  
 اس نے پھر آتشِ مزاج اک نغمہ پیدا کر دیا  
 عہدِ حاضر میں ہے سب کچھ ایک دل پیدا نہیں  
 مضطرب مجنوں کہ محل ہے مگر لیلیٰ نہیں  
 اس طرح تنہا تر پنا شمع کو آساں نہیں  
 آہ! اک پروانہ دنیا میں مے شایاں نہیں  
 کب تلک کرتا رہوں میں جستجوئے راز دار؟  
 اے رخِ روشن سے تیرے ماہِ وانجم کو صیّا!  
 چھین لے مجھ سے مجھ کیوں تو لے یہ شعلہ دیا  
 باز آیا اس سے اپنی امانت کو سنبھال  
 خارِ جوہر کو مرے آئینہ دل سے نکال

یا مجھے لٹہ کوئی ہمدردیرینہ دے مجھ کو میرے عشق عالم سوز کا آئینہ دے

موج کو دیکھو تو ہے دریا میں ہم پہلے موج موج سے مل کر محبت میں ترپنا خوتے موج

آسماں پر ہے ستارے کا ستارہ ہمنشیں رات کے زانو پہ رہتا ہے سرمایہ مبین

دیکھئے دن کو تو ہے وہ رات کا پہلو نشیں اور فردا کے سبب امروز بھی تنہا نہیں

نہر کو دیکھا ہے اکثر نہر میں ہوتے فنا بو، میں گم دیکھی ہے ہوتے موج باد صبا

زندگی کا ہے مزا مستوں کو پینے کے ساتھ رقص کرتا ہے ہر اک دیوانہ دیوانے کے ساتھ

نو، کہ اپنی ذات میں یکتا ہے بچوں و چرا تو نے بھی عالم کو اپنے واسطے پیدا کیا

آہ! دنیا میں مثال لالہ صحراہوں میں اس بھری محفل میں یعنی بکیں تنہا ہوں میں

دے مجھے بھی کوئی ہمدرد اے مے پروردگار جو مرے آئینہ دل کا بنے آئینہ دار

وہ مرا ہمدرد مگر دیوانہ و سرزنا نہ ہو جو خیال اس و اس سے یک قام بیگانہ ہو

تاکہ اس کی جاں کو اپنی ہوئے وحشت شو: دوں اس کے دل کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ لوں

اپنی مٹی سے بناؤں سپیکر اس محبوب کا

خود صنم اس کا بنوں خود ہی برہمن باد فنا